دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۴۹ ویں جلد

از جنوری ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۲ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۴۹

جنوری ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۲ء

(بترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین

جلد ٤٩

جنوری ١٩٤٢ء تا جون ١٩٤٢ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

"جلد ۴۹" ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۲ء "عدد ۱"

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ ۸ جنوری ۱۹۴۲ء کی شام کو سابق صدر اعظم ریاست حیدر آباد سر اکبر حیدری نے دلی میں وفات پائی، سر اکبر حیدری ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے وزیر مالیات اور پھر صدر اعظم ہونے کے سبب سے تمام اسلامی اداروں سے ایک خاص مربیانہ تعلق رکھتے تھے، اور اس بنا پر ان کا حادثۂ وفات ہم سب کے لئے غم والم کا باعث ہوا ہے، ان کی عمر اس وقت ۷۲ برس کی تھی، مگر اس عالم میں بھی جس انہماک، مصروفیت اور بیدار مغزی سے وہ اپنے مفوضہ خدمات کو انجام دیتے تھے اس سے ان کے غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہونے کا ثبوت ملتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

سندھ عربی زبان کے سفرِ ہند کی پہلی منزل ہے، اس لئے بیجا نہیں اگر صوبہ میں اس کے لئے سب سے پہلی عربی یونیورسٹی یا جامعۂ عربیہ کا قیام عمل میں آئے، سندھ کے موجودہ ڈائرکٹر تعلیمات ماشاء اللہ عربی زبان کے فاضل بھی ہیں، اس کام کے لئے اس سے بہتر موقع اور کیا مل سکتا ہے، اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے "سندھ عربک یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جماعت بن چکی ہے اور اسکی باقاعدہ رجسٹری ہو چکی ہے، اور سب سے پہلے ایک ٹریننگ کالج (دار المعلمین) جاری کرنے کی تجویز زیر غور ہے، ہم کو اس انجمن کے لائق کارکنوں سے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیں کہ مسلمانوں کو عربی زبان اور اس کی تعلیم اس لئے عزیز ہے کہ وہ ان کے مذہب کی خزینہ دار ہے، اس لئے

اس تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس سے ان کو اس خزانہ کی کنجی ہاتھ آئے،

آسٹرین نو مسلم محمد اسد جو مدت تک حجاز میں رہنے کے سبب سے عربی زبان سے واقف تھے اور انگریزی پر پہلے سے قدرت رکھتے تھے، انھوں نے ہندوستان میں آکر "اسلام اون کراس روڈ" نامی کتاب انگریزی میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی، اسکے بعد انھوں نے صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا، چند ہی پارے نکلے تھے کہ اس جنگ کے شروع میں وہ آسٹریا کے باشندے ہونے کے سبب سے نظر بند کر دئے گئے، اور اب ان کا سارا کاروبار اور پریس معطل ہے، اور ان پر مالک مکان کا کرایہ چڑھا ہوا ہے، ایک ہمدرد مسلمان چودھری نیاز علی صاحب (دار الاسلام پٹھان کوٹ) نے ان کا کرایہ کا قرضہ ادا کر دیا ہے، مگر پریس کے بہت سے باقی داروں کے قرضے ابھی باقی ہیں، انگریزی داں احباب سے التماس ہے کہ اسلامی ہمدردی کی خاطر ان کے ترجمۂ صحیح بخاری کے جو چار حصے شائع ہو چکے ہیں، وہ ان کو خرید کر داخلِ ثواب ہوں، ان کی اصل قیمت تو عہ فی حصہ اور چاروں حصوں کے دس روپیے ہیں، مگر اس وقت فی حصہ عہ ۸ر اور چاروں حصوں کے ۸ قیمت رکھی گئی ہے، پتہ یہ ہے (دار الاسلام جمال پور، پٹھان کوٹ، پنجاب)

ہم نے نومبر کے شذرات میں اس زمانہ کے بعض متکلمینِ اسلام کی خدمت میں جن میں کسی کا نام نہیں لیا تھا، کچھ عرض کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب نے خدا جانے کیوں اس لقب کو اپنے لئے خاص قرار دیا اور اس مخلصانہ عرض کو تعریض سمجھا اور اس کا لمبا جواب دیا، ہم نے عرض کیا تھا کہ حقائقِ اسلامی کو زمانہ کے ماحول کے مطابق زمانہ کی اصطلاحات میں ادا کرنا ہمیشہ تعبیرِ حقائق کے بجائے تغییرِ حقائق کا باعث ہوا ہے، اور مثلاً اس زمانہ کی ایک عام اصطلاح "تحریک" کو لکھکر ظاہر کیا تھا

کہ جو لوگ اسلام کو ایک تحریک قرار دے کر اس کے حقائق کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں وہ بلا ارادہ حقائق اسلام کی تغییر کے مرتکب ہو رہے ہیں، (ملخصاً)

فاضل مجیب نے اپنے جواب میں پہلے تو حسب دستور اپنے طول عبارت اور بڑے بڑے لفظوں سے مرعوب کرنا چاہا ہے، اور پھر تجدید اور تجدد کا خود ساختہ فرق ظاہر کرکے ہم کو ایک عظیم الشان نکتہ سمجھایا ہے جس کا وہ شکریہ قبول فرمائیں،

بے شبہ ان دونوں میں اتنے فرق کو تو ہم بھی اور سب عربی داں تسلیم کرینگے کہ تجدید بوزن تفعیل متعدی ہے، معنی نیا کرنا، اور تجدد بوزن تفعل لازم ہے، معنی نیا ہونا، اسکے علاوہ کوئی قلب حقیقت کا فرق ہم کو نہیں معلوم، مگر مدعی مجیب ہم کو یہ فرق بتاتے ہیں،

تجدید اور تجدد کا اصولی فرق یہ ہے کہ تجدید ہر زمانہ میں انہی حقائق اور انہی صداقتوں کو جو روز ازل سے چلی آرہی ہیں، اپنے زمانہ کی زبان میں اپنے زمانہ کی ذہنیتوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کرکے پیش کرتی ہے، اور تجدد اپنے زمانہ کے فتنوں سے متاثر ہو کر ان حقیقتوں اور صداقتوں ہی میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اگر ان حضرات کے نزدیک میں تجدد کا مجرم ہوں تو براہ کرم مجھے تعین کے ساتھ بتائیں کہ کہاں میں نے دین کے جوہر میں تغیر کیا ہے،

اصل سوال کا جواب آیندہ دیا جائیگا اس وقت صرف اس قدر عرض ہے کہ "ان حضرات" کے نزدیک حضرت مجیب تجدد کے مجرم ہوں یا نہ ہوں لیکن جناب مجیب بزعم خود دعوائے تجدید[1] کے مجرم تو علانیہ انکے قلم سے ہو رہے ہیں، کیونکہ وہ اپنے مقالات فقہی، مسائل کلامی اور رسائل سیاسی کو تجدید گمان کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان کے یہ چند سالہ کارنامے تجدید دین ہیں تو وہ اس صدی کے مجدد بننے کے بھی مدعی بن رہے ہیں اور "یہ حضرات" یہ کہتے ہیں،

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ   کہ عنقا را بلند است آشیانہ

[1] یعنی دعوائے تجدید،

مقالات

شہری مملکت مکہ

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ قانون بین الممالک جامعۂ عثمانیہ،

ہر زمانہ اور ہر ملک میں، قدیم مصر سے لے کر جدید امریکا تک، انسانی ذہنیت کی عظیم ترین ترقی، جدت پسندی اور کارگذاری شہری زندگی بسر کرنے والوں ہی میں نظر آتی رہی ہیں، جب تک لوگ چرواہوں یا کسانوں کے پیشوں پر اکتفا کرتے رہے اُس وقت تک معاشی وظائف کی تقسیم کے لئے کوئی خاص ترغیب نہیں پائی جاتی تھی اور لوگوں کی توانائیاں تمامتر غذا حاصل کرنے کی کوشش میں صرف ہو جایا کرتی تھیں، جب سے "شہر" وجود میں آیا تقسیم کار بھی ہونے لگا، معاشی بچت کے امکانات بھی پیدا ہوگئے اور یہیں سے دولت، فرصت، تعلیم، ذہنی ترقی، اور علوم وفنون کی توسیع ہونے لگی[1]

اس مقالہ[2] کا منشا صرف یہ ہے کہ علمی دنیا کو ایک ایسی زرخیز زمین کی تحقیق کے لئے متوجہ کیا جائے جسے اب تک بالکل ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اسلام نے جس حیرت انگیز تیزی سے توسیع حاصل کی اور اس کے آغاز ہی میں شہری مملکت مکہ کے غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ باشندوں

[1] انسائیکلوپیڈیا آف سوشیل سائنس تحت عنوان سٹی CITY (شہر) از ولیم منرو [2] مقالہ جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں ٹرونڈرم میں اورینٹل کانفرنس میں سنایا گیا،

جتنے کثیر غیر معمولی طور سے قابل مدبر پیدا ہوئے وہ ایسے حقائق ہیں جن کا کچھ نہ کچھ پس منظر ہونا ناگزیر ہے، نپولین (نا پولیون)[1] نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عرب مسلمانوں کی بہادری کا راز غالباً اس واقعہ میں پوشیدہ تھا کہ اسلام سے پہلے ان میں بڑے طویل عرصہ سے خانہ جنگیاں ہوتی رہی تھیں جنھوں نے ان میں بعض اوصاف پختہ کر دیئے ہوں گے[1]، ۱۹۳۵ء میں سوربون (پیرس) میں ایک پبلک لکچر دیتے ہوئے میں نے یہ چیز واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ آغازِ اسلام کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق قائم ہو چکا تھا جس کا باعث وہاں کے سالانہ میلے اور وہاں کے کاروانوں کا نہایت ترقی یافتہ نظام خفارہ (بدرقہ) تھے، بہ ظاہر یہ معاشی وفاق نیز یہ واقعہ کہ پورے ملک میں ایک ہی بولی بولی جاتی تھی، ایک ہی طرح سے وہ فال دیکھا کرتے تھے، مختلف بتوں یا دیوتاؤں کو وہ مشترکہ طور سے مانتے تھے، اور بڑی حد تک ان کے رسم و رواج بھی یکساں ہی تھے، اس لئے ان چیزوں نے سیاسی اتحاد کے لئے بہت کچھ زمین ہموار کر دی اور جب اسلام آیا تو اس نے جزیرہ نمائے عرب کے مزاج میں بڑی تیزی سے ایک مرکزیت پیدا کر دی، اب میں ایک دوسرا نظریہ اضافہ کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شہر مکہ کے باشندوں نے اپنی شہری مملکت کے لئے ایک ترقی کناں دستورِ اسلام سے خاصا عرصہ قبل بنا لیا تھا جس کے ذریعہ سے ان کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ آیندہ اسلامی دور میں عربی شہنشاہیت کے نظم و نسق کو چلا سکیں، یہ شہنشاہیت بیس ہی سال کے عرصہ میں مدینہ کی چھوٹی سی شہری مملکت سے پھیلتے ہوئے رومی، ایرانی اور دیگر حکومتوں پر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں میں چھا گئی تھی، یورپ کے سلسلے میں یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۲۷ھ مطابق ۶۴۷ء میں خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اسلامی فوجیں اسپین میں گھس چکی تھیں اور کئی نسلوں کے بعد طارق کے آنے اور فتح

---

[1] نا پولیون کی نوشتہ فرانسیسی "یادداشت جزیرہ سینٹ ہیلینا" جلد ۳ ص ۱۸۲،

کو مکمل کرنے تک وہیں قابض و مقیم تھیں[1]،

عرب کی شہری مملکتوں کا مطالعہ ابھی کچھ سنجیدہ طور سے شروع نہیں کیا گیا ہے، اس غرض کیلئے میں مکہ کے سوا کسی اور شہر کا بھی انتخاب کر سکتا تھا، مثلاً طائف، دومۃ الجندل، تیما، سبا، عدن، صحار وغیرہ، لیکن مکہ کے انتخاب کے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں، مثلاً مکہ کے متعلق ہمارے معلومات دیگر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ یقینی اور زیادہ کثیر ہیں، مکہ اسلام کا گہوارہ تھا، یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا اور بڑے ہوئے تھے، یہیں آپ کی تبلیغی زندگی کا بڑا حصہ صرف ہوا تھا، اور اولین اسلامی شہنشاہیت کی قریب قریب تمام نمایاں ہستیاں اسی شہر میں پیدا ہوئیں، اور یہیں تربیت پائی تھی، مزید براں یہی وہ شہر تھا جس پر قبضہ کے لئے تین ہمعصر شہنشاہیتوں میں رقابت چلی آرہی تھی، رومی، ایرانی اور حبشی تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند تھے، اگر کتاب التیجان کے مؤلف ابن ہشام کی بات پر یقین کیا جائے تو سکندر ذو القرنین[2] تک نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد یعنی کعبہ کی زیارت کرے[3]،

ابھی بیان ہوا کہ رومی، ایرانی اور حبشی تینوں سلطنتیں مکہ پر قبضہ کی خواہشمند تھیں، چنانچہ رومیوں کے سلسلہ میں یہ ایک واقعہ ہے کہ ایلیوس گالوس کے زمانہ سے نیرو کے زمانہ تک ہر رومی شہنشاہ کی یہ تمنا رہی کہ اپنا اثر و نفوذ کسی طرح مکہ تک پھیلا دے، چنانچہ اس کے لئے متعدد کوششیں عمل میں لائی جاتی رہیں[4]، ابن قتیبہ کی بات پر اگر اعتبار کیا جائے تو قیصر روم نے

---

[1] تاریخ طبری ۲۷ھ ص ۲۸۰۷، نیز دیکھئے گبن کی انگریزی تاریخ انحطاط و زوال روما جلد ۵ ص ۵۵۵ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، [2] میرے خیال میں "ذو القرنین" (یعنی دو سینگوں والا) کا لقب سکندر اعظم کو عربوں کی طرف سے دیئے جانے کا اصلی باعث یہ تھا کہ مقدونیہ والے ایک ٹوپی پہنا کرتے تھے جس پر دو سینگیں ہوتی تھیں، ان کا یہ قومی لباس ابتک باقی ہے، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب یوگوسلافیا کے بادشاہ الگزنڈر کو مارسیلز میں قتل کر دیا گیا تو اس کی لاش کے ساتھ اس کے تمام شاہی زیوروں وغیرہ کیساتھ اسکی دو سینگوں والی ٹوپی بھی رکھی گئی تھی (الروم ذات القرون کی اصطلاح کو دیکھئے)، [3] بلاذری کی فتوح البلدان طبع مصر ص ۵۱، [3] نیز دیکھئے عینی شرح بخاری ۲۶۵ اور ازرقی کی اخبار مکہ بر موقع، [4] لامنس فرانسیسی کتاب مکہ ہجرت سے پہلے صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۳،

خود قصی کو مدد دی تھی کہ مکہ پر وہ قبضہ کر لے[1]، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قصی نے خود مختاری برتنی شروع کر دی اور رومی مفادات نظر انداز کرنے شروع کر دیئے، چنانچہ چند نسلوں بعد جب مکہ کے عثمان بن الحویرث الاسدی نے عیسائیت قبول کی تو قیصر روم نے اسے ایک تاجِ شہریاری سے سرفراز کیا اور ایک فرمان دے کر مکہ روانہ کیا جس میں حکم تھا کہ مکہ والے اُسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں، عثمان کے لئے بڑے اچھے مواقع حاصل تھے، کیونکہ مکہ والے غلہ اور دیگر ضروریات اور نیز اپنے تجارتی کاروانوں کے لئے مصر، فلسطین اور شام کے رومی صوبوں کے دست نگر تھے اور وہ آسانی سے فرمانِ قیصری کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، لیکن عین لمحۂ آخر میں عثمان ہی کے ایک رشتہ دار نے جلسہ میں اٹھ کر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ مکہ کے آزاد باشندے بادشاہت اور امرائیت کی بدعتوں کو کیسے قبول کر سکتے ہیں، اور اس خیال کا خوب ہی مضحکہ اُڑایا اور دم کے دم میں جلسہ کی رائے بدل گئی، عثمان بیزار ہو کر شام واپس چلا گیا اور قیصر روم نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ اپنی قلمرو مکہ والوں کے لئے بند کر دی اور ان کے جو تاجر اس وقت وہاں تھے ان کو قید کر لیا[2]، (یہ واقعہ غالباً اس کے بعد پیش آیا ہوگا جب قیصر نے آنحضرت صلعم کے پر دادا ہاشم کو اس بات کا منشور عطا کیا تھا کہ وہ تجارت کے لئے شام آیا کریں، نیز ایک سفارشی خط نجاشیِ حبش کے نام دیا تھا کہ وہ بھی مکہ والے تاجروں کو اپنے ملک میں آنے دیا کرے[3]) قیصر اس وقت اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا کیونکہ ایران سے جنگ چھڑ گئی تھی، الواحدی نے کتاب اسباب النزول[4] میں بیان کیا ہے کہ مدینہ کا ابو عامر راہب وہاں والوں کو

---

[1] معارف ابن قتیبہ طبع یورپ ص ۳۱۳ [2] الفاسی طبع یورپ ص ۴۴۱ سہیلی کی الروض الانف ۱/۱۴۶ لانمس کی مذکورۂ بالا کتاب مکہ ص ۲۷۰، اسپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدی جلد ا ص ۸۹ تا ۹۰ [3] تاریخ یعقوبی ۱/۲۸۰ تاریخ طبری ص ۱۰۸۹، طبقات ابن سعد جلد ا حصہ اول ص ۴۳ و ۴۵ لسان العرب تحت کلمہ "ایلاف" لانمس کی مذکورہ کتاب مکہ ص ۱۲۰ وغیرہ، تفسیر طبری وغیرہ میں سورۂ ایلاف کی تشریح [4] اسباب النزول ص ۱۹۵،

یہ کہکر دھمکایا کرتا تھا کہ "میں قیصر کی فوجیں بلواؤں گا"

قریش کا رحلۃ الشتاء والصیف

کاروانی راستے
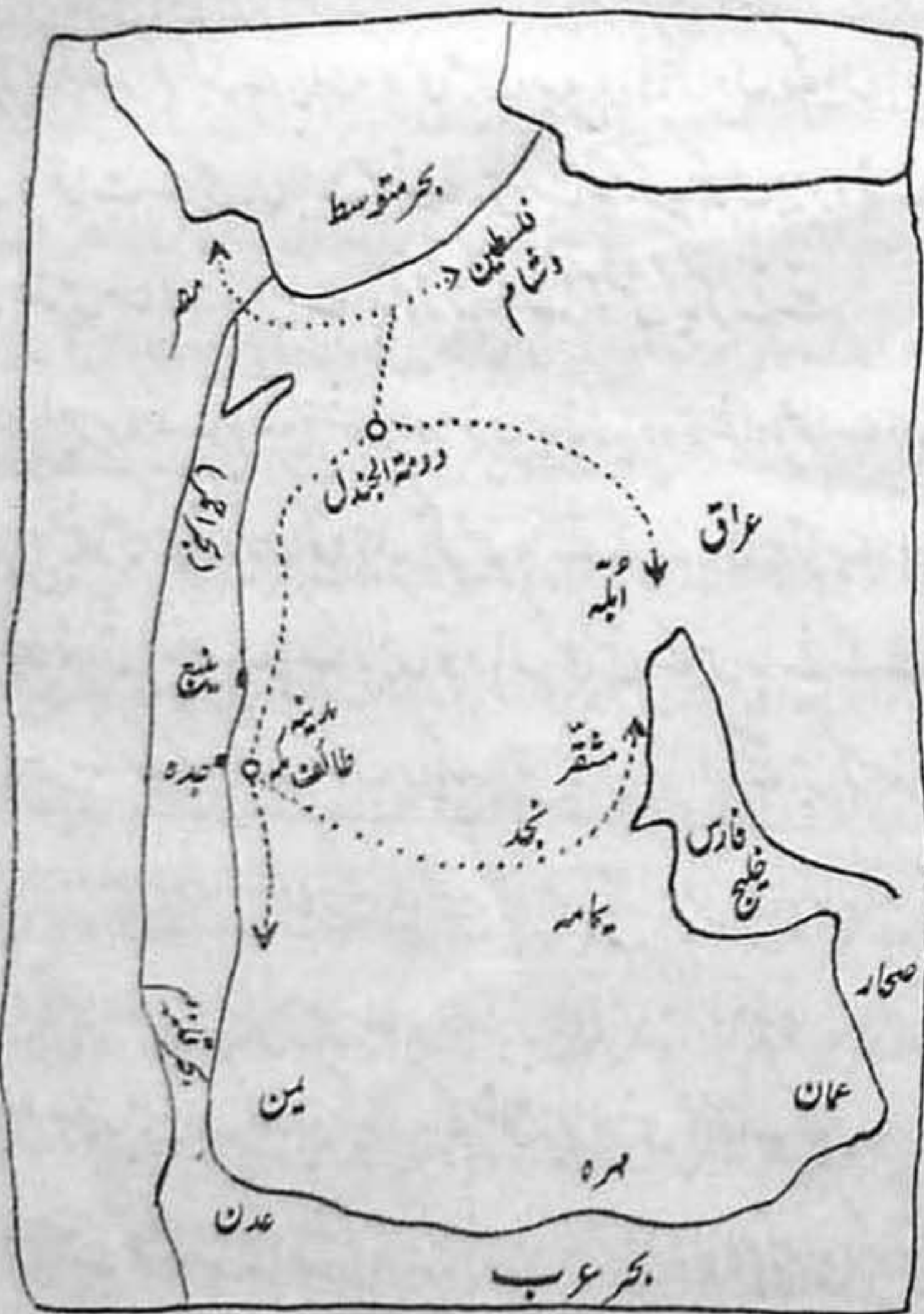
ایرانیوں کے سلسلہ میں تاریخیں بتاتی ہیں کہ یمن کی فتح کے بعد وہ خیال کرنے لگے تھے کہ مکہ خود بخود ان کے اقتدار میں آچکا ہے، چنانچہ خسرو ایران نے ایک مرتبہ گورنر یمن کے نام حکم لکھ بھیجا تھا کہ جناب رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایران جاکر شہنشاہ سے ملنے کی ہدایت کرے اور اگر رسولِ عربی اس سے انکار کریں تو آپ کو گرفتار کرکے مدائن روانہ کرے[۱]،

حبشیوں کے سلسلہ میں یہ مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے مکہ پر ایک چڑھائی کی تھی[۲] جس میں ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی محمود[۳] کے ساتھ کمان کر رہا تھا،

اس قسم کے بیشمار تذکرے عرب مولفین کے ہاں ملتے ہیں کہ مکہ کے اور دیگر اقطاع عرب کے معززین قیصر روم، کسرائے ایران، نجاشی حبش وغیرہ بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوا کرتے تھے، ان واقعات سے بھی اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ یہ حکمراں جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی حصہ میں مسالمانہ ذرائع سے اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے،

جغرافیہ شہر | جزیرہ نمائے عرب کا شمالی اور مغربی حصہ زیادہ تر بنجر اور صحرا ہے، ایک چھوٹا سا نخلستان اور چشمہ بھی ہو تو لوگوں کو وہاں آکر بس جانے کے لئے کافی ہوتا ہے اور اگر کسی تجارتی راستہ پر ایسے قدرتی انتظامات پائے جائیں تو وہاں کسی بستی کے بس جانے کے لئے اور بھی زیادہ سہولت ہوتی ہے، مکہ کاروانی راستوں پر ایک اہم اسٹیشن تھا اور کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم

[۱] تاریخ طبری ص ۱۵۷۲ و مابعد [۲] دیکھئے کسی تفسیر میں سورۂ فیل نیز فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک سلسلہ ۱۱ (۱۹۱۶ء) ص ۵ تا ۴۳۷ اور اطالوی رسالہ R.S.O جلد ۹ ص ۷۳۰ و مابعد میں کونتی روسینی کے مضامین عرب میں حبشیوں کی خانہ جنگیوں کے متعلق، نیز لامنس کی کتاب مکہ ص ۲۰۰ و مابعد، [۳] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹ و مابعد، معلوم نہیں کہ حبشیوں نے محمود کا عربی نام کیوں رکھا تھا، شاید یہ لفظ MAMMOTH کا معرب ہو، جو ایک گرانڈیل قسم کے ہاتھی کو کہتے ہیں،

کے زمانہ میں یہ ایک آباد شہر تھا جہاں وہ آیا جایا کرتے تھے، عرب مولفین[۱] ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس زمانہ میں گھنے جنگل اور اچھی چراگاہیں اس وادی میں پائی جاتی تھیں جہاں مکہ بسا ہوا ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جد اعلیٰ قصی نے جنگل کا بڑا حصہ صاف کردیا[۲]، تاکہ اپنے اور اپنے قبیلہ والوں کے گھروں کے لئے معبد کعبہ کے اطراف جگہ فراہم کی جائے، بعد کے زمانوں کے متعلق بھی ہمیں اسی طرح کے ثبوت ملتے ہیں[۳]، خود آج بھی بوا ہیر کی رباط مکہ معظمہ میں اتنی شاندار ہے کہ وہ وادی غیر ذی زرع[۴] کے کسی مکان کی جگہ بمبئی کی ملیبار ہل کے کسی قصر سے مشابہ ہے، مکہ تجارت کے لئے شام، یمن اور طائف و نجد جانے والے کاروانوں کا جنکشن تھا اور چشمۂ زمزم کے قریب آباد ہوا تھا، اور ہر طرف بلند اور ناقابلِ تسخیر پہاڑیوں نے اُسے جنگی نقطۂ نظر سے بھی محفوظ بنا دیا تھا، اس کی ابتدائی تاریخ بہت دھندلی ہے، وہاں کی سیاسی زندگی سے آیندہ باب میں بحث ہوگی، جس مقام پر اور جس طور سے شہر بسا تھا اس کی کچھ تفصیلیں یہاں بیان کی جاتی ہیں،

قدیم یونانی شہروں کے دو حصّے ہوتے تھے "پولس" اور "استو" یعنی بلند اور پست حصّہ شہر، نامعلوم زمانہ سے مکہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے: معلات اور مسفلہ۔ اور یہ تقسیم آج تک پائی جاتی ہے، کسی قدیم تر زمانہ میں ان دونوں حصوں کا نام بکہ اور مکہ رہا ہوگا، چنانچہ ازرقی[۵] نے اپنی تاریخ مکہ میں بیان کیا ہے کہ بکہ وہ مقام ہے جہاں معبد تعمیر ہوا ہے اور مکہ پوری بستی کا نام ہے، قرآن مجید

[۱] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۷۴ نیز کتاب الاغانی ۱۳/۱۰۸ [۲] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ص ۱۰۹۷، قطب الدین کی الاعلام باعلام بلد اللہ الحرام ص ۴۴ [۳] جرہمی دور کے لئے دیکھئے ازرقی کی اخبار مکہ ص ۷۴ [۴] قرآن مجید ۱۴/۳۷ میں مکہ کے جائے وقوع کو یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی، اگرچہ حالیہ زمانوں میں نہر زبیدہ کے باعث شہر میں سرسبزی نظر آنے لگی ہے اور سعودی دور میں باغات بھی ترقی کرنے لگے ہیں [۵] اخبار مکہ ص ۱۹۷ سطر ۱۲ "بکۃ موضع البیت ومکۃ القریۃ"۔
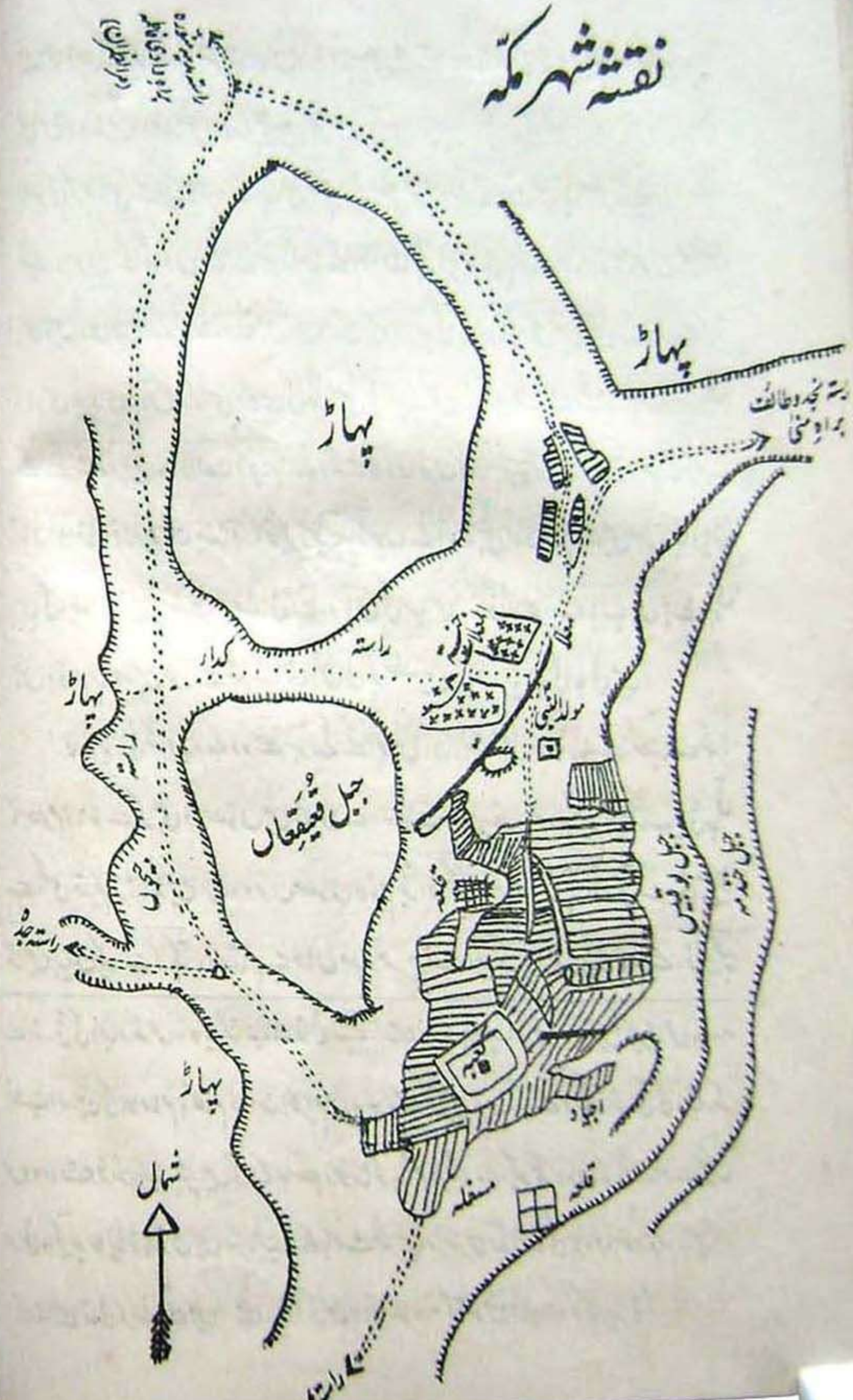
میں بھی اس کی تائید ہوتی نظر آتی ہے، چنانچہ ایک آیت میں ہے، "وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے (بغرضِ عبادت) بنایا گیا وہ وہ ہے جو بکہ میں ہے[۱]" اور ایک دوسری آیت میں ہے، "یہ وہی تھا جس نے ان کو تم پر حملہ کرنے سے اور تم کو ان پر حملہ کرنے سے وادی مکہ میں روک دیا تھا[۲]" مکتین[۳] (دو مکے) کی اصطلاح، قریتین[۴] (دو شہر) کے معنوں میں ابن ہشام نے استعمال کی ہے جس سے مکہ اور طائف کی دو ہمشیر بستیاں مراد لی گئی ہیں، اس سے بھی اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے،

ظاہر ہے کہ معززین محلات میں رہتے تھے اور شہر کی عبادت گاہ اور قبرستان بھی وہیں آباد تھے، تاریخ ہمیں یقین دلاتی ہے[۵]، کہ جب قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو اپنے تمام رشتہ داروں کو ظواہر یعنی مضافاتِ شہر سے بطحا، یعنی مرکزِ شہر میں منتقل کر دیا تھا اور عبادت گاہ یعنی کعبہ کے سامنے ہی دار البلد تعمیر کیا جس کا نام دار الندوہ یعنی مشورہ گاہ رکھا گیا[۶]، مکہ کی عبادت گاہ (یعنی کعبہ) دیوتاؤں کا ایک آماجگاہ (دیوستھان) (PANTHEON) بن گیا تھا جہاں (۳۶۰) بت تھے[۷] جو مختلف قبائل[۸] کے معبودوں کی نمایندگی کرتے تھے، لات اور عزیٰ[۹] اصل میں علی الترتیب طائف اور نخلہ کے لوگوں کی دیویاں تھیں اور کعبہ کے احاطہ میں بھی ان کے مثنی (DUPLICATES) پائے جاتے تھے اور مکہ والوں کے نزدیک بھی ان دیویوں کا بڑا احترام تھا[۱۰]،

---

۱ قرآن مجید ۳/۹۶ ۲ ایضاً ۴۸/۲۴ ۳ سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲۱ و ۵۱۹ ۴ قرآن مجید ۴۳/۳۱ نیز کامل المبرد ص ۲۹۱، بلاذری کی کتاب (انساب الاشراف ۶ بحوالہ لامنس) صفحہ ۳۴ و ۳۷ ۵ سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰ ۶ قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۳۴ ۷ ازرقی کی اخبار مکہ ص ۷۳ تا ۷۴، ابو نعیم کی المنتقی مخطوطہ بزم ادب حیدر آباد دکن ورق نمبر ۲۰۵ تا نمبر ۱۲۰۶ ۸ دیورژے کی فرانسیسی کتاب عرب ص ۱۰۱ عمود اول ۹ یہ بت بہت چھوٹے ہوں گے، چنانچہ تاریخ طبری ص ۱۳۹۵، اور کتاب الاغانی ۱۴/۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ احد کے دن ابو سفیان ان کو اٹھائے لئے جا رہا تھا ۱۰ سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵ کلبی کی کتاب الاصنام بر موقع،

یونانی شہروں ہی کی طرح[1] مکہ کے اطراف بھی ایک ماتحت سرزمین تھی جسے حرم کہتے تھے اور جو تخمیناً سوا سو مربع میل پر مشتمل تھی[2]، اسلام نے حدودِ حرم میں مزید توسیع کردی اور شہر کی وہ سرحدیں قرار دیں جو اب "میقات" کہلاتی ہیں اور جہاں سے حاجیوں کو اپنا معمولی لباس اتار کر احرام پہننا پڑتا ہے،

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانہ میں مکہ میں کوئی بازی گاہ، گھوڑ دوڑ کا میدان، کسی مہم پر روانہ ہونے کے لئے فوج کا اجتماع گاہ اور محصورہ و محفوظ چراگاہیں (حمیٰ) تھیں یا نہیں، مدینہ وغیرہ دوسرے شہروں کی حد تک البتہ ان چیزوں کا کافی پتہ چلتا ہے، مکہ کے ایک محلہ کا نام "اجیاد" ہے جس کے معنی اچھی نسل کے گھوڑوں کے ہیں، اگرچہ یاقوت وغیرہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ اور بتاتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ اس کو گھوڑ دوڑ سے بھی کچھ تعلق رہا ہو،

پروفیسر ہیا لیڈے نے یونانی شہری مملکتوں پر اپنے دلچسپ مضمون میں لکھا ہے کہ

"جب وہ پُر آشوب دور ختم ہوگیا جس میں ترکِ وطن کے عظیم الشان سلسلے جاری تھے تو بجائے اس کے کہ جنگ ایک عادتی حالت سمجھی جائے، ہمہ گیر امن کا دور دورہ ہوگیا اور خانہ بدوشی کی جگہ بستیوں میں توطن اختیار کیا جانے لگا،

لیکن یہ شہر کس طرح وجود میں آئے؟ قدیم ترین بستیاں بے شبہ گاؤں میں ہوئی ہونگی۔ . . . . . . بہرحال عام طور پر چند دیہات کے مجموعہ نے اس چیز

---

[1] فلپسن کی انگریزی کتاب "قدیم یونان اور روما میں بین الممالک قانون اور رواج" جلد ۱ ص ۲۸، وارڈ فاؤلر کی انگریزی کتاب "شہری مملکت" بر موقع، ہیالیڈے کی ہسٹری آف دی ورلڈ شائع کردہ ہیامرٹن؛ ب یونانی شہری مملکتیں صفحہ ۱۱۰۲ [2] حدود حرم کا جو ذکر ازرقی ص ۳۰۶ تا ۱۰۶، اور احمد ابن محمد الخضراوی کی العقد الثمین فی فضائل البلد الامین (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۴ھ) ص ۱۳ میں ہے، اس سے یہ اندازہ کیا گیا،

کو مناسب پایا ہوگا کہ کسی پہاڑ یا خود میدان میں اچھی طرح مدافعت کئے جانے کے قابل مقام کو قلعہ بنا کر مستحکم کرلے تاکہ اگر کسی موسمِ گرما کی لوٹ کے لئے نکلی ہوئی ہمسایوں کی ٹکڑی ان پر ٹوٹ پڑے تو اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو وہاں حفاظت کے لئے بھیج سکیں؛ . . . . . . اس قلعہ میں دیوتا کا مندر اور بادشاہ کا محل بھی عموماً ہوا کرتے تھے، اس کے بعد ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ عوام اپنے دیہات کو چھوڑ کر پناہ لینے کیلئے شہر کے قریب رہنے لگیں اور وہاں سے روزانہ اپنی کھیتیوں کو جانے لگیں، معززین کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ بادشاہ کے آس پاس اور حکومت کے مرکز میں رہیں، اس طریقہ سے بلند حصۂ شہر یا قلعہ کے اطراف ایک پست حصۂ شہر آباد ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ پست حصۂ شہر کے اطراف ایک شہر پناہ یا فصیل بھی تعمیر ہونے لگی[1]"

قریب قریب یہی صورتِ حال حجاز کی بھی تھی۔

مکہ جس مقام پر آباد ہے وہاں ایک گہری وادی ہے، جس کے چاروں طرف اونچے اور ناقابلِ عبور پہاڑ ہیں، شہر میں صرف ایک شاہراہ ہے جو ایک طرف سے داخل ہوکر دوسری طرف نکل جاتی ہے، ذیلی راہیں شہر میں آنے جانے کے لئے صرف دو ہیں[2]، یہاں کے باشندوں کو اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ کوئی فصیل بھی تعمیر کریں، اس کے باوجود ہمیں قطب الدین کی تاریخ مکہ میں حسبِ ذیل ذکر ملتا ہے:

قدیم زمانوں میں مکہ میں بھی شہر پناہ کی دیواریں پائی جاتی تھیں، چنانچہ معلاۃ کے رُخ جبل عبداللہ بن عمر اور اس کے سامنے کے پہاڑ کے مابین ایک وسیع دیوار پائی جاتی تھی، اس میں ایک دروازہ تھا جس پر لوہے کے پتر جڑے ہوئے تھے، یہ ہندوستان

---

[1] ہسٹری آف دی ورلڈ ۱۱۰۴/۲ [2] مرآۃ الحرمین ۱۸۸/۱ نیز دیکھئے کوئی نقشۂ شہر مکہ،

کے ایک بادشاہ نے امیر مکہ کے پاس بطور تحفہ روانہ کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک اور دیوار مسفلہ کے رخ میں بھی درب الیمن نامی محلہ میں تعمیر کی گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ تقی الفاسی نے بیان کیا ہے کہ "معلات میں مذکورۂ بالا دیوار کے علاوہ ایک اور دیوار بھی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مکہ کی یہ دیواریں کب تعمیر ہوئی تھیں نہ یہ کہ ان کو کس نے تعمیر کیا تھا اور نہ یہ ہی کہ ان کی مرمت کس نے کی تھی"۔ میں نے بعض تاریخوں میں دیکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المقتدر کے زمانہ میں ایک دیوار پائی جاتی تھی؛[1]

یہ دیواریں غالبًا اسلام سے پہلے کی انہی بھدّی دیواروں کی جگہ نئے سر سے تعمیر کی گئی ہونگی، وادی مکہ میں سب سے کشادہ اور مسطح مقام شروع ہی سے قومی عبادت گاہ کے لئے محفوظ رہا، عرب مولفؒ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس وادی کے پرانے باشندے اتنے وہمی تھے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے قریب اپنے رہنے کے لئے کوئی عمارت تعمیر کرنی روا نہیں رکھتے تھے، مکانات انھوں نے مضافاتِ شہر میں بنوائے اور کعبہ کے قریب صرف خیمے لگائے جاتے تھے، مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے عبادت گاہ کے اطراف گھر تعمیر کئے وہ قصیؔ تھا، اس جدت یا بدعت پر عوام کو آمادہ کرنے کے لئے اس نے یہ استدلال کیا کہ

"اگر تم عبادت گاہ کے اطراف رہنے لگو تو لوگ تم سے ڈرا کریں گے اور لوٹ مار کے لئے تم پر حملہ کرنے سے باز آجائیں گے"؛

یہ کہہ کر قصیؔ نے سب سے پہلے خود ہی اپنے لئے مکان تعمیر کیا، جس میں قومی مشورہ گاہ یعنی دار الندوہ بھی تھا، یہ کعبہ کے شمالی رخ تعمیر ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کہتے ہیں کہ وہ اس جگہ تھا جہاں آجکل حنفی مصلیٰ

[1] قطب الدین کی کتاب مذکورۂ بالا ص ۷، [2] تاریخ طبری ص ۱۰۹۷، نیز قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۴۳۔

بنا ہوا ہے[1]، مکہ کی اس عبادت گاہ کے باقی تین طرف جو زمین تھی وہ قصیؔ نے قریشی قبائل میں بانٹ دی جہاں انھوں نے اپنے رہنے کے گھر تعمیر کرلئے[2]،

سیاسی نظام | مکہ پر جُرہمیوں کی حکومت تھی، قصیؔ نے ان کے سردار کی بیٹی سے شادی کی اور جب وہ مرگیا تو قصیؔ سرداری کی وراثت کا دعویدار بن گیا، قصیؔ کا تعلق قبیلۂ قضاعہ سے تھا، چنانچہ اس خانہ جنگی میں قبیلۂ قضاعہ نے قصیؔ کی مدد کی، اور اگر ابن قتیبہ کی بات پر یقین کیا جائے تو خود قیصر روم[3] نے بھی قصیؔ کو مدد دی، جس کا منشاء بظاہر یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ ہونے والی تجارت کے گذرگاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے،

سرداری حاصل کرنے کے بعد قصیؔ[4] کو وہاں متعدد سیاسی ادارے موجود ملے ہوں گے مثلاً معبدِ کعبہ کی تولیت کا عہدہ وغیرہ، کوئی تعجب نہیں جو اس ذہین شخص نے خود بھی چند نئے ادارے قائم کئے ہوں تاکہ اپنے اقتدار کو محفوظ و مستحکم کرے، لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ قصیؔ کے زمانہ میں جن دس سرکاری[5] عہدوں کا مکہ میں پتہ چلتا ہے ان میں سے کتنے قصیؔ کے قائم کردہ تھے اور کتنے قدیم ادارے ہی تھے، شہر میں ایک دار الندوہ[6] بنانا اور رفادہ[7] کے نام

[1] قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۴۳ [2] ایضاً [3] معارف ابن قتیبہ ص ۳۱۳ (مطبوعۂ یورپ) [4] قصیؔ کے حالات کے لئے دیکھئے مارٹن ہارٹ مان کا مضمون جرمن رسالہ اشوریات Z.F.Ass YRIOLOGIE) جلد ۲ ص ۴۳ تا ۴۹ [5] ابن عبد ربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵ تا ۴۶، اور زبیر بن بکار کی انساب قریش مخطوطہ استنبول جس کا حوالہ لامنس نے اپنی فرانسیسی کتاب مجلس سہ گانہ (FRi (-ل MVIRAT) ص ۱۱۴ میں دیا ہے [6] ابن ہشام ص ۸۰، ۳۰ طبری ص ۱۰۹۹، ابن سعد جلد اول حصہ اول ص ۴۹ اور اخبار مکہ مطبوعۂ یورپ مولفہ ازرقی ص ۶۵ [7] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳ تاریخ طبری ص ۱۰۹۹ طبقات ابن سعد جلد ا حصہ اول ص ۴۱ جز ثانیہ

سے ایک سالانہ محصول باشندگانِ شہر پر عائد کرنا صراحت کے ساتھ قصی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نسی، اجازہ، اور افاضہ کے ادارے قدیم خانوادوں ہی کے ہاتھ میں رہنے دیئے گئے تھے،[1] بہرحال عام طور پر قصی کے ہاتھ میں چھ عہدوں[2] کا ہونا بیان کیا جاتا ہے، یہی عہدے اہم تر بھی تھے اور آمدنی کا ذریعہ بھی اُن ہی سے تھا،

ابن عبد ربہ[3] اور دیگر مولف بیان کرتے ہیں کہ مکہ میں دس ہی سرکاری عہدے تھے، جن کو دس قبائل کے سردار موروثی طور سے انجام دیا کرتے تھے، ممکن ہے کہ یہ عہدے ابتدا میں دس ہی رہے ہوں، جیسا کہ وینیس اور پالمیرا میں تھا، چنانچہ شابو[4] کے حوالے سے لامنس[5] نے بیان کیا ہے کہ

دس ارکان کی ایک مجلس ہوتی تھی جو دس بڑے خانوادوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی، کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پالمیرا میں اس طرح کی ایک مجلس موجود اور کارفرما تھی جس کے علاوہ ایک مجلس عام یا سینیٹ بھی تھی جس کا اپنا صدر اور اپنا معتمد ہوا کرتا تھا، مجلس دہگانہ اور سینیٹ قانون بناتے، قوانین مالی کے نفاذ کی نگرانی کرتے اور ضرورت پر سزاؤں کے احکام دیتے، . . . .

جس کے بعد لامنس نے بیان کیا ہے کہ

"یہ لاحاصل کوشش ہو گی کہ اس کے مماثل کسی ادارے کی تلاش ہم مکہ کے نظام میں کریں"۔

حقیقت میں ہمیں دس سے بہت زیادہ اداروں کا پتہ چلتا ہے جن کی تفصیل عرب مولفوں کی کتابوں کی ورق گردانی پر معلوم ہو سکتی ہے، خود ابن عبد ربہ نے اگرچہ صراحت سے بیان کیا ہے کہ مکہ میں سردار دس ہی تھے، لیکن خود اسی مؤلف نے سترہ عہدوں کے نام گنائے ہیں اور بعض

---

[1] تاریخ طبری ص ۱۰۹۴، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۸۰، [2] ازرقی ص ۶۶ (اور ستہ) [3] العقد الفرید ۲/۴۴ [4] شابو (CHABOT) کی فرانسیسی کتاب پالمیرا کے کتبوں کا انتخاب ص ۲۳ وغیرہ [5] لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۹

سرداروں کو ایک سے زیادہ عہدوں پر مامور بتایا ہے، ان سترہ عہدوں پر ہم موجودہ مواد سے چار پانچ اور عہدوں کا بڑی آسانی سے اضافہ کر سکتے ہیں، چنانچہ ان کی ایک فہرست یہ ہے:-

(۱) ندوہ (۲) مشورہ (۳) قیادہ (۴) سدانہ (۵) حجابہ (۶) سقایہ (۷) عمارۃ البیت (۸) افاضہ (۹) اجازہ (۱۰) نسی (۱۱) قبہ (۱۲) اعنۃ (۱۳) رفادہ (۱۴) اموال محجرہ (۱۵) ایسار (۱۶) اشناق (۱۷) حکومہ (۱۸) سفارہ (۱۹) عقاب (۲۰) لواء (۲۱) حُلوان النفر،

مجلس دہگانہ کے الجھے ہوئے مسئلہ کو نظرانداز کر کے میں چاہتا ہوں کہ شہری مملکت مکہ کے دستور کی ساخت اور کارکردگی کو اپنے طور پر واضح کروں،

چنانچہ اولاً آبادی یا شہریوں کو "جماعۃ"[1] کا نام دیا جاتا تھا، یہ لفظ جناب رسالت مآب صلعم نے بھی برقرار رکھا اور اس سے مراد آپ کے زمانہ میں آپ کے متبعین کی پوری جماعت ہوتی تھی، جو باقی دنیا سے ممتاز ایک وحدت تھی اور بحرین کے حکمران کے نام جو مکتوب نبوی گیا،[2] اس میں بھی اسے دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس "جماعت" میں شریک ہو جائے، "ملت"[3] کا لفظ سیاسی سے زیادہ مذہبی مفہوم رکھتا تھا، قرآن مجید میں "قوم"[4] کا لفظ ایک وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس میں نہ صرف عام رائے دہندگانِ شہر بلکہ ایک حد تک جملہ ساکنینِ ملک شامل معلوم ہوتے ہیں، جن لوگوں کو حق رائے حاصل ہوتا تھا اور وہ شورائے عمومی میں حصہ لینے کے مجاز ہوتے تھے اُن کو قرآن میں ہمیشہ "ملأ"[5] کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور یہ "ملأ" کی "تراضی" یعنی رضا مندی ہی ہوتی تھی جس کے مطابق مقامی حکمراں فیصلہ کرتا، چنانچہ قرآن مجید میں بھی لفظ تراضی استعمال

---

[1] مغازی واقدی ص ۵۹ سطر ۳ [2] طبقات ابن سعد جلد ۲ حصہ اول ص ۲۷، حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب "اسلامی سیاست خارجہ بہ عہد نبوی وخلافت راشدہ" ص ۴۴، نیز الوثائق السیاسیہ بر موقع

[3] دیکھئے قرآن مجید ۲/۱۳۰، ۳/۹۵، ۴/۱۲۵ وغیرہ [4] قرآن مجید ۴/۹۶ و ۹/۱۰۷، ۱۲۶، ۱۱/۲۷ و ۳۷، ۲۳/۲۴ و ۳۳ وغیرہ

[5] قرآن مجید ۲/۲۴۶، ۷/۶۰،

ہوا ہے[۱]،

قرآن مجید میں جہاں کہیں فرعون کی "ملأ" کا ذکر ہے اس سے بنی اسرائیل خارج نظر آتے ہیں جن کو کوئی شہری حقوق حاصل نہ تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں جو عزیز مصر تھا اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں جو ملکۂ سبا تھی ان کے ہاں بھی قرآن مجید[۲] کے مطابق جو مجلس شوریٰ تھی اس کا نام "ملأ" ہی تھا، اس مجلس میں "اولو قوۃ" یا اہل حل وعقد ہی ہوا کرتے تھے اور اگر کوئی چیز نامناسب پیش آتی تو یہ مداخلت بھی کیا کرتے[۳]، پالمیرا میں جو مجلس شوریٰ تھی اس کے متعلق بھی ایسا ہی مواد ملتا ہے[۴]،

مکہ میں جو دار الندوہ تھا اس میں صرف معمر اہل مکہ شریک ہو سکتے تھے، چنانچہ ازرقی[۵] اور ابن دُرید[۶] نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ دار الندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم از کم چالیس سال کی ہو، صرف حکمران شہر قصی کے بیٹوں کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ عمر کی اس شرط سے مستثنیٰ تھے[۷]، غالباً اسی حق رائے کی عمر چہل سالگی ہی کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید نے "حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً"[۸] کے الفاظ میں بیان کیا ہے، یہ قصی کے زمانہ کا ذکر تھا، بعد کے زمانوں میں مختلف نرمیاں برتی جاتی نظر آتی ہیں، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل[۹] کو تیس ہی سال کی عمر میں اس کی عمدہ رائے (لجودۃ رأیہ) کے باعث دار الندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جاتا تھا اور حکیم بن حزام[۱۰] کو تو بیس یا پندرہ ہی سال کی عمر میں یہ عزت حاصل ہو گئی تھی، یونان کے شہر اسپارٹا میں تو مجلس

---

۱ قرآن مجید ۲/۲۳۳، ۴/۲۹ ۲ قرآن مجید ۱۲/۴۳، ۲۷/۲۹ و ۳۲ ۳ الفاسی کی اخبار مکہ صفحہ ۱۰۹ ۴ لامنس کی کتاب مکہ ص ۹۷ ۵ ازرقی کی اخبار مکہ ص ۶۴، ۶۵، ۶۵، ۴۶۵ ۶ کتاب الاشتقاق ص ۹۷ ۷ ازرقی ص ۶۴، ۶۵، ۶۵، ۴۶۵ ۸ قرآن مجید ۴۶/۱۵ ۹ ابن دُرید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۷ سطر (۶) ۱۰ ابن عساکر کی تاریخ دمشق جلد (۴) ص ۴۱۹ سطر (۲)

شوریٰ واقعی مجلسِ معمرین تھی، چنانچہ ساٹھ سال[۱] سے کم عمر کا کوئی شخص وہاں کی مقامی مجلسِ شوریٰ (GEROUSIA) میں شریک ہی نہیں ہو سکتا تھا،[۲]

قصیؔ سے پہلے مکہ والے یا تو کسی کھلے مقام پر مشورے کے لئے جمع ہوا کرتے ہوں گے یا اپنے سردار کے خیمے میں، اس غرض کے لئے ایک مستقل عمارت بنانا قصیؔ کے لئے مقدر ہو چکا تھا، قصیؔ ہی نے اسے دار الندوہ نام دیا تھا، اور جنابِ رسالت مآب صلعم کے ملک الشعرا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس نام کی یاد اپنے اشعار میں باقی رکھی ہے،[۳] یہ مشورہ گاہ کعبہ کے شمال میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن زمانۂ اسلام میں اُسے منہدم کر کے کعبہ کے اطراف جو مسجد حرم بنی اس کی توسیع کے کام میں لایا گیا، یہ ظاہر ہے کہ اس مجلس کا انعقاد معینہ اوقات پر نہیں ہوتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً جب بھی ضرورت پیش آئے ہوتا،[۴]

اسی دار الندوہ میں مشورے ہوا کرتے، جنگوں کا اعلان کیا جاتا یا مدافعتی تدبیروں پر بحث و غور ہوتا،[۵] یہیں شادیاں بھی رچائی جاتیں،[۶] اور تجارتی معاہدے طے ہوتے،[۷] بیرونی مہمان آتے تو ان کی ضیافت بھی یہیں ہوتی،[۸] نیلگری کے قدیم باشندوں کی طرح[۹] زمانۂ قبل اسلام کے مکہ والے بھی ایک رسم کرتے جو لڑکی کے سنِ بلوغ کو پہنچنے پر انجام دی جاتی اور اسے ایک نئی اور پوری قمیص (درع) پہنائی جاتی اور وہ بے نقاب آتی اور بے نقاب ہی جاتی، گھر پہنچنے

---

[۱] اس کے مماثل ہندوستانی کہاوت "ساٹھا پاٹھا" کی طرف توجہ منعطف کرائی جا سکتی ہے۔ [۲] پلوٹارک کی سوانح عمریاں دیکھئے لائیکرگس کے حالات، نیز وارڈ فاؤلر کی انگریزی کتاب "شہری مملکت" ص ۱۷ تعلیق نمبر ۲۔ [۳] دیوان حسان بن ثابت مطبوعہ یورپ نظم نمبر ۱۴۵ و ۱۲۳۔ [۴] کتاب الاشتقاق مؤلفہ ابن درید ص ۹۰۔ [۵] چنانچہ مثال کے طور پر ہجرت سے قبل رسول کریم صلعم پر قاتلانہ حملہ کرنے کی بحث و تمحیص یہیں ہوئی تھی۔ [۶] لامنس کی کتاب مکہ ص ۷۰۔ [۷] مغازی واقدی شائع کردہ فون کریمر ص ۳۲۳۔ [۸] کتاب نیلگری مؤلفہ حمید اللہ شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

کے بعد اس پر پابندیاں عائد ہو جاتیں، اس رسم کا منشا یہ تھا کہ لڑکی کے قابلِ نکاح ہونے کا اعلان کیا جائے اور خواستگار آگاہ ہو کر رونمائی کے لئے آسکیں، یہ رسم بھی دار الندوہ ہی میں انجام پاتی،[۱]

دار الندوہ شہر مکہ کا مرکزی دار البلد تھا اس کے علاوہ شہر میں جتنے محلے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنے ہی مجالسِ محلہ بھی تھے، ان کو "نادی"[۲] کہا جاتا تھا جیسا کہ شہر مدینہ میں محلہ وار مجالس کو سقیفہ یعنی مسقف سائبان کا نام دیا گیا تھا، نادی اور دار الندوہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں چنانچہ مشہور محدث و لغت نویس ابو عبید[۳] نے نادی اور ندوہ دونوں کا مادہ "ندا" ہونا بتایا ہے، قرآن مجید نے لفظ نادی کو حیاتِ جاوید عطا کر دی ہے اور "فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ"[۴] اور "وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ"[۵] دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور ماضی مضارع کے صیغے بھی ان کے علاوہ مستعمل ہوئے ہیں،[۶] ان نادیوں یا قبائلی مجالسِ محلہ میں اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعہ سے مولیٰ یعنی فردِ خاندان بنانے کی رسم بھی انجام دی جاتی تھی،[۷] اور کسی فردِ خاندان کو بے راہ روی وغیرہ پر جات باہر ("طرد" یا "خلیع") کرنے کا اعلان بھی وہیں کیا جاتا تھا،[۸] محلہ والے اور بعض وقت دیگر محلوں کے دوست بھی چاندنی راتوں میں یہاں جمع ہو کر مسامرہ یعنی شبانہ قصہ گوئی کیا کرتے تھے،[۹] تجارتی معاملات اور کاروانوں کی آمد یا روانگی بھی ان ہی قبائلی نادیوں سے ہوا کرتی تھی،

اتھنس (اتینا) کے متعلق جاوٹ (JOWETT) نے اپنی کتاب THUCYDIDES[۱۰]

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰۔ [۲] تفصیلات کے لئے دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ ص ۸۸ وما بعد۔ [۳] غریب الحدیث ورق نمبر ۱۹۱ ب (بحوالہ مکہ مؤلفہ لامنس ص ۹۰)۔ [۴] قرآن مجید $\frac{96}{17}$۔ [۵] قرآن مجید $\frac{29}{29}$۔ [۶] قرآن مجید میں نادیٰ، ناد وا، نادیتم، نادینا، نادت، ینادی، ینادون، نودی، تنادوا، نداء، ندیا، منادی، تناد کے لفظ بھی بار بار آئے ہیں۔ [۷] سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۳ و ۳۴۶، کتاب الاغانی $\frac{14}{99}$۔ [۸] اغانی $\frac{13}{112}$ و $\frac{3}{53،52}$۔ [۹] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷۶، اغانی اور لامنس کی کتاب مکہ ص ۹۳ وما بعد تعلیق نمبر ۱۔ [۱۰] دیکھئے جلد اول ص ۱۰۴ (بحوالہ وارڈ فاؤلر ص ۴۸ تا ۴۹)

میں لکھا ہے کہ ۔

قرقروب (CERCROPS) اور ابتدائی بادشاہوں کے زمانہ میں حتی کہ تیسیوس (THESEUS) کے زمانہ تک شہر اثینا مختلف محلوں میں منقسم تھا جن میں سے ہر ایک کے اپنے مجالسِ محلہ اور مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے، بجز اس کے کہ کوئی خطرہ درپیش ہو پورے شہر کی آبادی کا اجلاس جو بادشاہ کی صدارت میں ہوتا، نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ لوگ اپنے معاملات کا انتظام اپنے مجالسِ محلہ ہی میں آپس کے مشورہ سے طے کر لیا کرتے تھے،

مکہ میں نقیب کا عہدہ بھی پایا جاتا تھا جسے منادی اور مؤذن کہتے تھے ۔ (مؤذن اپنے ان ابتدائی معنوں میں اب تک شامی بدویوں میں مستعمل ہے[1]) جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے[2]، ہر قبیلہ کے سردار کے پاس اس کے اپنے خصوصی ایک یا زائد منادی بھی ہوا کرتے تھے[3]، یہ منادی نہ صرف غیر معمولی انعقادِ مجالس کی اطلاع مشتہر کرتے تھے بلکہ کسی تقریب یا دعوت میں دعوتیں پہنچانا اور کسی فرد خاندان کے جات باہر کئے جانے کی اطلاع اور محلوں میں بھی کرنا اُن ہی سے متعلق تھا، غیر معمولی صورتوں میں منادی کے علاوہ دیگر عام لوگ بلکہ اجنبی اشخاص بھی مجالسِ بلدیہ کے انعقاد کی اطلاع کے مجاز تھے، ایسی صورتوں میں اجنبی لوگ اپنے تمام کپڑے اتار دیتے اور کسی اونچے مقام پر بالکل برہنہ ہو کر دہائی دیا کرتے، عربی داں "النذیر العریان" کی اصطلاح سے اچھی طرح باخبر ہیں،

---

[1] دیکھئے لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۰، تعلیق ۳ [2] ابو عبید کی کتاب الاموال ف ۴۵۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ۹ھ تک بھی ایسا ہی ہوتا تھا [3] تاریخ یعقوبی جلد (۱) ص ۲۸۱ سطر ۱۴، نیز ص ۲۹۰ و ۲۹۲، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۴ و ۶۵، اسی مؤلف کی فرانسیسی کتاب گہوارۂ اسلام جلد ۱ ص ۲۲۹ کتاب الاغانی جلد ۱ ص ۶۵ سطر ۵، ابن درید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۸، مفضلیات مطبوعہ یورپ ۲/۲،

مورخین کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی پورے شہر کا ایک واقعی مطلق العنان اور با اقتدار بادشاہ تھا، جس کا ہر لفظ قانون کا حکم رکھتا تھا[1]، بعد کی نسلوں نے شکر گذاری اور احسان مندی کے ساتھ اس کی یاد باقی رکھی اور اسے مجمّع[2] کا خطاب[3] عطا کر دیا تھا، کیونکہ اسی نے جملہ قریشی قبائل کو متحد کر کے شہر میں انہیں دیگر آبادی میں ایک اعزازی حیثیت عطا کر دی تھی، قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قائم ہو گئی کیونکہ خود قصی نے مختلف انتظامی عہدے اپنے مختلف بیٹوں میں بانٹ دیئے تھے[4]، اور غالباً مشہور مجلس دہگانہ[5] کا آغاز اسی طور سے ہوتا ہے جو زمانۂ اسلام تک باقی نظر آتی ہے، اس سے ہمیں انکار نہیں کہ قصی کو مطلق العنان اختیارات حاصل رہے ہونگے اور اس کا کوئی حریف و مدمقابل نہ ہوگا، کیونکہ اس نے اپنی قوم کے لئے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے، لیکن بعد کے زمانوں میں سید الناس[6] وغیرہ کے القاب سے کہیں ہم یہ نہ خیال کریں کہ مکہ میں بھی مثلاً وینیس کی طرح کوئی دوجے (DOGE یا قائد و سردار) ہوا کرتا تھا، شہر مکہ کے عہدوں میں ایک قیادہ[7] بھی بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا منشا کیا تھا پوری طرح معلوم نہیں ہوتا، ولہوزن بھی اپنے عالمانہ اور دلچسپ مقالہ ...... EIMGEN EINWESEN OHNE CBRIGKE-IT (یعنی ایک سیاسی اجتماعیت بغیر سرداری کے) میں اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ شہر مکہ میں کوئی فردی حکومت نہ تھی، اس میں شک نہیں کہ عرب کے مختلف حصوں میں فردیت یا بادشاہت کی طرف رغبت پیدا ہو چلی تھی، چنانچہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عثمان[8] بن الحویرث نے مکہ میں بادشاہ بننے کی کوشش کی تھی، مدینہ میں عبداللہ بن

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۴ [2] سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ص ۱۰۹۵ [3] مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۹۳ [4] ابن عبدربہ کی العقد الفرید جلد ۲ ص ۴۵ اور مسعودی کی مروج الذہب ۳/۱۱۹ تا ۲۰۱، ۴/۱۲۱ [5] ازرقی کی اخبار مکہ ص ۶۴، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۹ [6] ازرقی ص ۶۴ [7] روض الانف ۱/۱۴۴،

ابی بن سلول کے لئے تو تاجِ شہریاری[1] کی تیاری تک کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی کہ اتنے میں جناب رسالت مآب صلعم کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے ساتھیوں کے لئے اس کا موقع نہ رہا کہ کسی کو بادشاہ بنانے کی تجویز کر سکیں، اسپرنگر کو یقین تھا کہ "یہ لوگ یعنی عرب کے بدوی اپنی بدویانہ زندگی کے باوجود فردیت یعنی بادشاہت کی طرف میلان رکھنے لگ گئے تھے[2]۔"

(باقی)

---

[1] (لِیُتَوِّجُوْہُ) صحیح بخاری ۷۹/۲، تاریخ طبری ص ۱۵۱۱ و مابعد، سیرۃ ابن ہشام ص ۴۲۰، نیز قرآن مجید ۶۳/۸ کی تشریح کسی تفسیر میں [2] اسپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدیہ ۱/۲۴۹

خطبۂ صدارت

انجمن جامعۂ ادبیہ کان پور

از مولٰنا عبدالسلام صاحب ندوی

مولٰنا عبدالسلام صاحب ندوی نے کان پور کی ادبی انجمن جامعہ ادبیہ کے سالانہ جلسہ کے شعبۂ نثر میں یہ خطبۂ صدارت پڑھا تھا، اردو زبان میں نظم کے رموز و نکات پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن نثر پر بہت کم توجہ کی گئی ہے، اس خطبہ میں اس حیثیت سے نثر پر نظر ڈالی گئی ہیں اور اس میں نثر کے متعلق بعض نئی اور مفید باتیں ہیں، اس لئے اس کو ناظرین معارف کے لئے پیش کیا جاتا ہے، "م"

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

حضرات!! میں آپ لوگوں کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھ کو اس ادبی جلسہ کی صدارت کا اعزاز عطا فرما کر اردو زبان کی ایک اہم صنف کے متعلق ایک ایسے شہر میں اظہار خیال کا موقع دیا ہے جو اس قسم کے علمی اور ادبی مباحث کے لئے نہایت موزوں ہے،

حضرات! ظاہر بینوں کے لئے تو آپ کا شہر کان پور صرف تجارتی گرم بازاری کی ایک منڈی ہے، لیکن اہل نظر کے نزدیک وہ نہایت قدیم زمانہ سے علم و فن کا ایک بڑا مرکز بالخصوص مشرقی علوم و فنون کی ترقی و نشو و نما کا بہت بڑا گہوارہ رہ چکا ہے، مدرسہ فیض عام اسی شہر

کا ایک مشہور مدرسہ تھا جس کا فیض ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پہنچا، مدرسہ جامع العلوم نے
اسی شہر میں ہندوستان کے دور دراز حصوں کے طلبہ کی جمعیت خاطر کا سامان بہم پہنچایا اور
انھوں نے اس شہر کے ارباب خیر کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر نہایت سکون و اطمینان کیساتھ
تحصیل علم کی علمی اور مذہبی حیثیت کے ساتھ ادبی حیثیت سے بھی اس شہر کو نمایاں امتیاز حاصل
رہا ہے، لکھنؤ کی قربت کی وجہ سے یہاں شیخ ناسخ ہی کے زمانہ سے شعر و شاعری کا چرچا پھیلا،
اور اب تک یہاں کے لطیف الخیال اور خوش مذاق لوگ اس بادۂ کہن کے نشہ میں مخمور نظر
آتے ہیں، اس وقت اردو زبان اور اردو علم ادب کی خدمت کا جو ولولہ یہاں کے لوگوں میں
پایا جاتا ہے وہ اسی قدیم زمانہ کی یادگار ہے، جدید دور میں اردو زبان کی خدمت و اشاعت
کا جو عام ذوق اور جو عام جذبہ پیدا ہوا، اس میں بھی اس شہر نے نمایاں حصہ لیا،
منشی دیا نرائن نگم نے اپنے رسالہ زمانہ کے ذریعہ سے اردو زبان، اردو لٹریچر اور اردو علم
ادب کی جو پائدار خدمت انجام دی ہے، وہ اہل ادب کے لئے ناقابل فراموش احسان ہے،
منشی رحمت اللہ رعد مرحوم نے اپنے مطبع کے ذریعہ سے دور جدید کے برگزیدہ لٹریچر کی
جس قدر اشاعت کی، وہ اس شہر کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے، الفاروق، الکلام سوانح
مولانا روم، اور البرامکہ جیسی اہم کتابیں اسی مطبع نے ایسی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ
چھاپ کر شائع کیں کہ اندھوں کے دلوں میں بھی اردو زبان کی کتابوں کے پڑھنے کا شوق
پیدا ہوگیا،

اس شہر کی علمی و ادبی خدمات کی یہ چند مثالیں ہیں جنھوں نے تمام ہندوستان کو اپنا
زیر بار احسان بنا لیا ہے، لیکن اس عام احسان کے ساتھ میں خاص طور پر اس شہر کا اس
لئے اور بھی ممنون ہوں کہ میں نے عربی کی ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی اور شعر و سخن اور

علم ادب کا ذوق اسی شہر میں پیدا ہوا، جس کا نشہ اب تک میرے سر میں ہے، شعر الہند جو میری
ناچیز ادبی خدمات میں شمار کی جاتی ہے اس کا اصلی مواد مجھکو اسی شہر سے حاصل ہوا، اور میرے
بزرگ دوست مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے اپنے کتب خانہ کی وہ تمام نادر کتابیں
جو اس کتاب کی تصنیف کے لئے ضروری تھیں، مجھ پر وقف کردیں، انھی احسانات کا بوجھ
ہلکا کرنے کے لئے میں نے صدارت کی یہ خدمت قبول کی ہے، ورنہ اس کا مقصد حصول اعزاز
نہیں ہے، کیونکہ میں اپنی عدم اہلیت کی وجہ سے کسی اعزاز کا مستحق نہیں ہوں، البتہ ایک ادنیٰ
خادم کی حیثیت سے علم و ادب کی خدمت کو اپنا فخر سمجھتا ہوں، اور میں خوش ہوں کہ آپ
نے مجھ کو اپنے خدمت گذاروں کی صف اولیں میں کھڑا ہونے کا پُر فخر منصب عطا فرمایا،

حضرات! آپنے اس جلسہ میں مجھکو علم ادب کی جس صنف کے متعلق اظہار خیال کا موقع دیا ہے اس پر اب تک اردو زبان
میں بہت کم لکھا گیا ہے، نظم کے متعلق تو اردو زبان میں تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے کافی ادبی سرمایہ موجود ہے لیکن نثر کے
ترکیبی اجزاء کے متعلق اب تک اردو میں کوئی مستند لٹریچر موجود نہیں، حالانکہ اگر نثر کے حسن و قبح
اور عیب و ہنر سے علمی اصول کے مطابق بحث کی جائے تو عربی علم ادب کی کتابوں میں
اس کا اس قدر کافی مواد موجود ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن میں
اس موقع پر اپنی مختصر تقریر کو کتاب یا رسالہ بنانا نہیں چاہتا، البتہ نثر کے متعلق اصولاً چند
ادبی نکات بیان کرنا چاہتا ہوں،

(۱) حضرات! اس سلسلہ میں سب سے پہلی تمہیدی بحث یہ ہے کہ نظم و نثر کی ادبی اور
افادی حیثیت کیا ہے؟ اور اس حیثیت سے ان دونوں میں کس صنف کو ترجیح حاصل ہے؟
عام دستور تو یہ ہے کہ جو شخص جس موضوع پر کچھ لکھتا یا بولتا ہے خواہ مخواہ اس کے بہت سے
فضائل و مناقب بیان کرتا ہے، لیکن بحمد اللہ کہ مجھے اس قسم کی سخن سازی کی ضرورت نہیں ہے

کیونکہ خود اہلِ ادب نے نثر کو ادبی حیثیت سے نظم پر ترجیح دی ہے اور دلیل یہ قائم کی ہے کہ نظم میں وزن اور قافیہ کی پابندی کی وجہ سے شاعر کو بعض غیر ضروری الفاظ بڑھانے پڑتے ہیں، جن کو اصطلاح میں حشو کہتے ہیں، مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا پڑتا ہے جس کا نام تعقید ہے، بعض اوقات فصیح الفاظ کے بجائے سبک اور غیر فصیح الفاظ بھی ضرورتِ شعری کی وجہ سے استعمال کرنے پڑتے ہیں، اور وزن وقافیہ کی ان پابندیوں کا اثر معانی ومطالب پر یہ پڑتا ہے کہ نظم میں معانی ومطالب الفاظ کے تابع ہو جاتے ہیں، حالانکہ اصولاً الفاظ کو معانی ومطالب کا تابع ہونا چاہئے، لیکن نثر میں اس قسم کے لفظی تصرفات کی ضرورت نہیں واقع ہوتی، اس لئے نثر میں الفاظ معانی ومطالب کے تابع ہوتے ہیں جو اصل مقصود ہیں، اس دلیل کی تائید میں اہلِ ادب نے اس قسم کی بہت سی مثالیں جمع کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کبھی نثر کو نظم کے قالب میں ڈھالا گیا ہے تو بہت سے غیر ضروری الفاظ بڑھ گئے ہیں، اس کے بخلاف جب کسی نظم کو نثر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے تو غیر ضروری الفاظ چھٹ گئے ہیں، اور قدرتی طور پر کلام میں ایجاز واختصار پیدا ہو گیا ہے اور عبارت اس سانچے میں ڈھل کر بالکل سڈول ہو گئی ہے،

ادبی حیثیت کے ساتھ افادی حیثیت سے بھی نثر کو نظم پر ترجیح حاصل ہے، کیونکہ نظم میں زیادہ تر ہجو وبدگوئی، عشق ومحبت، تملق وچاپلوسی اور شراب وکباب وغیرہ کے مضامین بیباکانہ طور پر بیان کئے جاتے ہیں جو اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے قابلِ اجتناب ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی پیغمبر آج تک شاعر نہیں ہوا، بالخصوص خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں شاعری کو رسول اللہ صلعم کی شانِ رسالت کے منافی قرار دیا اور ارشاد فرمایا

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ — یہ قرآن شاعر کا کلام نہیں،

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ ، — ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر کی تعلیم نہیں دی کیونکہ وہ ان کی شانِ رسالت کے لئے موزوں وسزاوار نہ تھی؛

خود اہلِ عرب بھی جن کے یہاں شاعری ایک بڑی طاقت سمجھی جاتی تھی، انہی غیر سنجیدہ مضامین کی بنا پر شاعری کو متانت اور وقار کے مخالف سمجھتے تھے، چنانچہ عرب کے مشہور شاعر امرء القیس نے جو ایک بادشاہ کا لڑکا تھا جب اپنی بزمِ شراب میں ایک رندانہ شعر پڑھا تو اس کے باپ نے اس کو قتل کر دینا چاہا، نابغہ جعدی جو عرب کا ایک ممتاز شاعر ہے، پہلے اپنے قبیلہ کا سردار تھا، لیکن جب شعر کہنے لگا تو اس کی سیادت وقیادت کا خاتمہ ہو گیا،

اس کے بخلاف نثر زیادہ تر اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور مذہبی مضامین پر مشتمل ہوتی ہے اور اس نے اس کا پایہ اس قدر بلند کر دیا ہے کہ وہ ایک پیغمبر کا معجزہ بن سکتی ہے، نظم نے ساحرانہ طاقت تو بے شبہ حاصل کر لی ہے، لیکن اس کو معجزانہ طاقت کبھی نصیب نہیں ہوئی،

(۲) نظم ونثر کے باہمی موازنہ اور نثر کے ترجیحی وجوہ بیان کرنے کے بعد ایک اہم ادبی بلکہ ادبی سے زیادہ علمی اور فلسفیانہ بحث یہ ہے کہ نثر کس کو کہتے ہیں؟ اور نثر کی ادیبانہ تعریف کیا ہے؟ عام طور پر کلام انسانی کی تقسیم دو صنف میں کی گئی ہے، یعنی نظم ونثر، اس کے علاوہ بہ ظاہر کلام کی کوئی تیسری قسم نہیں ہے، لیکن بعض دقیق النظر لوگوں نے کلام کی ایک ایسی قسم کی طرف اشارہ کیا ہے جو نظم ونثر دونوں سے الگ ہے اور میں اسی اشارہ کی توضیح کرنا چاہتا ہوں،

پروفیسر محی الدین قادری نے اپنی کتاب روحِ تنقید میں دو شخصوں کا جو غالباً ادب

ہونے کے ساتھ فلسفی بھی تھے، ایک مختصر سا مکالمہ نقل کیا ہے، ان میں ایک سوال کرتا ہے،

تو سوائے نظم اور نثر کے کوئی تیسری صورت ہے ہی نہیں ؟

دوسرا جواب دیتا ہے،

"جی ہاں جو چیز نظم نہیں وہ نثر ہے جو نثر نہیں وہ نظم ہے ،

پہلا پھر پوچھتا ہے،

اچھا آدمی جو بولتا ہے وہ کیا چیز ہے ؟

دوسرا نہایت متانت کے ساتھ کہتا ہے،

نثر

اب پہلا طنز آمیز تعجب سے سوال کرتا ہے،

ہائیں جب میں اپنے آدمی سے کہتا ہوں ذرا سلیپر لانا اور میرا کنٹوپ دیدینا، تو
کیا یہ نثر ہوئی ؟

دوسرا پھر اسی متانت سے جواب دیتا ہے،

جی ہاں !

پہلا پھر تعجب بلکہ تمسخر سے کہتا ہے،

ارے میاں سچ کہو یہ جو میں کچھ اوپر چالیس برس سے بولتا آیا ہوں یہ سب
نثر تھی اور مجھے کانوں کان خبر نہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ہر منظوم کلام شعر نہیں، اسی طرح ہر غیر منظوم کلام نثر بھی
نہیں، کیونکہ کلام منثور کے لئے صرف غیر منظوم ہونا کافی نہیں بلکہ اہلِ ادب کے نزدیک اس کے
لئے اور بھی بہت سے اجزا کی ضرورت ہے، چنانچہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الصناعتین میں

لکھا ہے، "مقرر اور انشا پرداز کا کامل ترین وصف یہ ہے کہ وہ شاعر ہو، اسی طرح شاعر کا
کامل ترین وصف یہ ہے کہ وہ خطیب ہو" یعنی مقرر، انشا پرداز، اور شاعر سب کا راگ
ایک ہی ہے، صرف ساز بدلا ہوا ہے، کیونکہ ادیبانہ نثر اگرچہ نظم نہیں ہے لیکن شاعری کے
تمام اجزا، مثلاً سلاست، روانی، برجستگی، توازن، تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع وغیرہ
سب کے سب اس کا لازمی جزو ہیں، اور ادیبانہ نثر کی بہترین کتابوں میں یہ اجزا نہایت
کثرت سے پائے جاتے ہیں، آسمانی کتابوں بالخصوص قرآن مجید میں یہ شاعرانہ اجزا اس
کثرت سے موجود ہیں، کہ دور جدید کے بعض ادیب اس کو نثر کی کتاب ہی نہیں سمجھتے، لیکن
اسی کے ساتھ اس کو نظم کی کتاب بھی نہیں تسلیم کرتے، بلکہ ان کے نزدیک قرآن مجید نہ نثر ہے
نہ نظم بلکہ صرف قرآن ہے، جس طرح انگور کہ نہ سیب ہے نہ انار، بلکہ صرف انگور ہے، اس سے
صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح اعلیٰ درجہ کی ادیبانہ عبارت حدِ اعجاز کو پہنچکر نظم و نثر دونوں
سے مختلف ہو جاتی ہے، اسی طرح ادنیٰ درجہ کا کلام بھی جس میں ہماری روزمرہ کی بول چال
شامل ہے، شاعرانہ خصوصیات سے معرا ہو کر نظم و نثر سے بالکل الگ ہو جاتا ہے، انسانی
کلام میں گلستان نثر کی اعلیٰ ترین کتاب ہے اور اس میں بھی شاعری کے یہ تمام اجزا یہاں تک
کہ اس دور کی مبغوض ترین چیز یعنی مقفّیٰ عبارتیں بھی بے ساختگی کے ساتھ موجود ہیں اور
انہی مشترکہ شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر نظم و نثر بظاہر متحد ہو گئی ہیں، چنانچہ روحِ تنقید میں
لکھا ہے کہ

یہ ایک عام خیال ہے کہ نثر اور نظم اپنی خصوصیات اور ترتیب ظاہری کے لحاظ
سے بالکل مختلف ہیں، لیکن جب ان کے امتیازی مادہ کی تحقیق کرنے بیٹھے تو
معلوم ہوتا ہے کہ نثر اور نظم کو مختلف النوع کہدینا زبانی تو آسان ہے لیکن

اس کو ثابت کر دکھانا دشوار ہے، موجودہ زمانہ میں تو نظم اور نثر میں بہت کم اختلاف باقی رہ گیا ہے، ایک طرف تو غیر مقفی یا نظم عاری لکھی جاتی ہے اور دوسری طرف نثری شاعری کے عنوان سے مضمون آرائی ہوتی ہے، جن کے مطالعہ کے بعد ہم تھوڑی دیر کے لئے متحیر ہو جاتے ہیں کہ کس چیز کو مابہ الامتیاز قرار دیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود اس شاعرانہ اشتراک کے نثر و نظم دونوں باہم مختلف ہیں، اور دونوں میں نمایاں مابہ الامتیاز موجود ہے، جہاں تک لفظی حیثیت سے شاعرانہ عناصر کا تعلق ہے نظم و نثر دونوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے، لیکن معنوی حیثیت سے نثر نظم سے بالکل مختلف ہے، نظم میں جو مضامین بیان کئے جاتے ہیں، وہ اور ہیں اور نثر جن مضامین پر مشتمل ہوتی ہے وہ اور ہیں، عشق و محبت کے مضامین، رندی و سرمستی کے خیالات، بوالہوسی و حسن پرستی کے جذبات، غرض اس کے غیر اخلاقی مضامین زیادہ تر نظم کا معنوی عنصر ہیں، بعد کو اگرچہ نظم میں ہر قسم کے اخلاقی، فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین بھی شامل ہو گئے، لیکن یہ امتزاج اس وقت ہوا جب نثر کی کتابوں نے ان مضامین کو شعراء سے روشناس کیا، اس کے بہ خلاف نثر میں جو مضامین بیان کئے جاتے ہیں، وہ زیادہ تر اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، اور مذہبی حیثیت رکھتے ہیں، رشد و ہدایت، تبلیغ و دعوت زہد و قناعت، تعاون و تعاضد، محبت و ہمدردی، اطاعت و فرمانبرداری، اعزہ پروری وصلہ رحمی، غرض اس قسم کے ہزاروں پاکیزہ خیالات کی اشاعت صرف نثر ہی کے ذریعہ سے کی جاتی ہے، عرب کی شاعری بہت سے رذائل اخلاق کا مجموعہ تھی، لیکن وہی عرب جب خطبہ دینے کھڑے ہوتے تھے، تو ان کے خطبات یکسر اخلاقی، قومی اور ملکی خیالات

و جذبات سے لبریز ہوتے تھے، قرآن مجید انہی خطبات کے انداز پہ نازل ہوا ہے، کیونکہ وہ اول سے آخر تک اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، اور مذہبی مضامین کا پاکیزہ مجموعہ ہے، اور یہ تمام مضامین شاعرانہ اسلوب عبارت میں بیان کئے گئے ہیں، اور انہی شاعرانہ اسلوب کی بنا پر اہل عرب قرآن مجید کو شعر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے، لیکن خداوند تعالی نے ان کو اس غلطی پر متنبہ کیا کہ نہ تو قرآن مجید شعر ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں وہ شعر و شاعری کے مضامین سے بالکل مختلف ہیں،

اب اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نثر نام ہے غیر منظوم شاعرانہ طرز بیان کا، جس کے ذریعہ سے اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی، مذہبی اور تمدنی مسائل بیان کئے جائیں، اور اس ادیبانہ نثر کا مافوق الفطرۃ نمونہ تو قرآن مجید ہے اور انسانی کلام میں مثلاً شیخ سعدی کی گلستان ہے، اور اس تعریف کے رو سے ہماری روزمرہ کی خط و کتابت، عدالتوں کے عرضی دعوے اور جواب دعوے، مدعی اور مدعا علیہ کی شہادتیں، حکام کے فیصلے، وکیلوں کی جرحیں غرض دفتری کاروبار کے تمام کاغذات، خواہ وہ ہندی زبان میں ہوں یا اردو زبان میں نظم و نثر دونوں سے الگ ہیں، جن میں ادب و انشا کا کوئی جزو شامل نہیں اور نظم و ترتیب کے لحاظ سے جیسا کہ شیخ عبدالقاہر جرجانی نے دلائل الاعجاز میں لکھا ہے، اس قسم کے کلام میں کوئی ادیبانہ اور شاعرانہ حسن نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتے ہیں، لیکن ادیبانہ نثر میں اسی شاعرانہ حسن سے دلفریبی پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس دفتری زبان کے متعلق ہندوستان کی دو قوموں میں جو افسوسناک نزاع قائم ہے، وہ ایک سیاسی یا قومی اور ملکی نزاع ہے، ادبی نزاع نہیں، اس لئے ادبی حیثیت سے ان دونوں

قوموں میں کوئی جھگڑا نہیں ہے، اس لئے اگر سیاسیات سے الگ ہو کر صرف ادبی اصول پر ادبی انجمنیں قائم کی جائیں جیسا کہ آپ کی یہ انجمن ہے تو وہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک عمدہ ذریعہ ہو سکتی ہے، میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ ہماری زبان میں منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور اقلیدس وغیرہ پر جو کتابیں لکھی یا ترجمہ کی جاتی ہیں، وہ بھی نثر کی کتابیں نہیں ہیں، بلکہ یہ علمی کتابیں ہیں، جو ہماری زبان کو علوم و فنون سے تو بے شبہہ مالا مال کر رہی ہیں، لیکن ہماری زبان کے ادبی حسن و جمال میں ان سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا،

ان تصریحات کے بعد آپ مجھ سے بجا طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں، کہ اس عظیم الشان ذخیرہ کے حذف کر دینے کے بعد اردو نثر کی ترقی کے لئے اور کون سا میدان رہ جاتا ہے، اس لئے میں اجمالی طور پر وہ موضوع متعین کر دیتا ہوں، جن میں ایک نثار یا ایک ادیب اور ایک انشا پرداز کا قلم اپنے جوہر دکھا سکتا ہے،

(۱) میرے خیال میں نثر کا ایک اہم موضوع تصوّف و اخلاق ہے، کیونکہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین اکثر لطیف تشبیہات و استعارات قصص و حکایات اور نقل و روایات کے ضمن میں واضح اور شگفتہ الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض اخلاقی کتابیں مثلاً انوار سہیلی اور اخلاق محسنی وغیرہ ادبی حیثیت سے فارسی کے قدیم نصابِ تعلیم میں داخل تھیں، عباسی دور میں عبداللہ بن المقفع نے ایک اخلاقی کتاب کلیلہ و دمنہ کا جو ترجمہ عربی زبان میں کیا ہے وہ ادبی حیثیت سے اس کا بہترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے، موجودہ دور میں مولانا اشرف علی صاحب کا اصلاحی، اخلاقی اور صوفیانہ لٹریچر اردو زبان میں نثر کا نہایت پاکیزہ مستند، صحیح اور اس کے ساتھ دلچسپ نمونہ ہے، اس لئے وہ صرف ایک صوفی منش عالم ہی نہیں ہیں، بلکہ اردو علم ادب کے بڑے خدمت گذار بھی ہیں،

(۲) نثر کا دوسرا اہم مظہر تاریخ و سیر کی کتابیں ہیں، اور اس سلسلہ میں مولانا شبلی مرحوم نے جو قابلِ قدر کتابیں اپنی یادگار میں چھوڑی ہیں، وہ اردو زبان میں نثر کا قابلِ تقلید نمونہ ہیں،

(۳) نثر کا ایک پُر جوش مظہر سیاست ہے، اور دنیا میں جس قدر بڑے بڑے سیاست داں پیدا ہوئے ہیں، وہ صرف سیاسی آدمی نہ تھے، بلکہ بہت بڑے ادیب اور انشا پرداز بھی تھے، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا شمار بہترین ادیبوں میں کیا جا سکتا ہے، اور یہ لوگ اگرچہ جو کچھ لکھتے ہیں انگریزی میں لکھتے ہیں تاہم اردو زبان میں ان کی تصنیفات یا مضامین کے جو ترجمے ہوتے ہیں وہ اردو علم ادب میں نثر کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، خود اردو لکھنے والوں میں مولانا ابو الکلام آزاد کا طرز تحریر اردو زبان کا ایک غیر فانی معجزہ ہے، جس کی تقلید ناممکن ہے، اور جن لوگوں نے اس کی تقلید کی ان کا وہی حشر ہوا جو مسیلمہ کذاب کا ہوا،

(۴) عام تذکروں، سطحی تاریخوں اور خیالی مضامین میں بھی نثر کی شگفتگی ظاہر ہو سکتی ہے اور اس حیثیت سے اردو زبان کے انشا پردازوں میں مولانا محمد حسین آزاد کا کوئی جواب نہیں، لیکن ایک دوسرے بزرگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی ہیں، جن کا معجزہ یہ ہے کہ انھوں نے سنجیدہ مضامین میں بھی اسی طرز انشا کی شگفتگی اور تر و تازگی کو قائم رکھا ہے،

(۵) تنقیدی لٹریچر بھی نثر کا ایک بڑا میدان ہے، اور اس میدان میں مولانا حالی کا نام سب سے مقدم اور سب سے نمایاں ہے اور مولانا شبلی کی بعض ادبی کتابیں بھی اس سلسلہ کی بہترین کڑی ہیں،

(۶) مذہبی، اخلاقی، اصلاحی اور تعلیمی لٹریچر بھی نثر کے لئے بہت زیادہ موزوں ہے، اور ادبی حیثیت سے ان کا بہترین نمونہ سر سید نے قائم کیا ہے، انھوں نے بہت سے مکمل

اور فلسفیانہ مضامین کو بھی نثر سے روشناس کیا ہے،

(۷) جدید فلسفہ میں بعض نفسیاتی اور اجتماعی مباحث میں بھی نثاری اور انشا پردازی کے جوہر دکھائے جا سکتے ہیں، اور اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ نہایت قابلِ قدر ہیں،

(۸) ناول اور افسانے سب سے زیادہ نثر کے لئے موزوں ہیں، اور محض اس بنا پر ان کی ادبی قدر و قیمت کو گھٹانا کہ اخلاق پر ان کا اچھا اثر نہیں پڑتا صحیح نہیں ہے، اولاً تو اس موقع پر ادبی بحث ہے، اخلاقی گفتگو نہیں، دوسرے خود یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ اس خیال کی کوئی اصلیت بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو علمی اور فلسفیانہ حیثیت سے اس کے مخالف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناول یا افسانوں سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، یا خود اخلاقی خرابیاں ناول اور افسانوں کے پیدا کرنے کا سبب ہیں، اور شاعری بالخصوص غزل کے متعلق بھی یہی بحث پیدا ہوتی ہے، بہرحال ادبی حیثیت سے ناول اور افسانے نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہیں، اور حکیم محمد علی کے ناولوں سے زیادہ شگفتہ اور رنگین نثر کا نمونہ اردو میں موجود نہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے ناولسٹوں اور افسانہ نگاروں کی خدمات قابلِ قدر نہیں، اس موقع پر صرف بہترین مثال دینا ہے، تمام ادیبوں اور انشا پردازوں کی فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں ہے،

(۹) نثر کا ایک نہایت دلچسپ مظہر ادیبانہ یا ظریفانہ خط و کتابت ہے، اور اس حیثیت سے مرزا غالب کے خطوط نثر کا بہترین مرقع ہیں، اس وقت مختلف لوگوں کے مکاتیب کے جو مجموعے شائع کئے گئے ہیں وہ ایک بڑی ادبی خدمت ہیں، بالخصوص مولانا شبلی کے مکاتیب کا پایہ نہ صرف ادبی حیثیت سے بلکہ علمی حیثیت سے بھی نہایت بلند ہے،

(۱۰) نثر کا ایک بڑا وسیع میدان خطبے اور تقریریں ہیں، اور اہلِ عرب کی نثر انہی خطبات تک محدود تھی، بعد کو خلفا، و سلاطین اور دوسرے سیاسی لوگوں کے خطبات نثر کا بہترین نمونہ قرار دیئے گئے، اور عربی علم ادب کی کتابوں میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کئے گئے جو عربی نثر کی بنیاد قرار پائے، ایک ادیب کا قول ہے کہ "انشا پردازی کو خطابت ہی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے اور انشا پرداز لوگ خطیبوں ہی کے راستہ پر چلے ہیں" اس لئے اردو زبان میں جو پرجوش اور فصیح و بلیغ خطبات موجود ہیں ان کو جمع کرنا اور ان پر نثر کی بنیاد ڈالنا ایک بڑی ادبی خدمت ہے، اور سر سید، نواب محسن الملک، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریریں اس میدان میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں،

ان تمام اقسام کے بعد ایک دلچسپ بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ اخباروں کے اڈیٹر ادیبوں اور انشا پردازوں کے زمرہ میں شامل ہیں یا نہیں؟ مدت ہوئی میں نے کسی عربی رسالہ میں اس موضوع پر ایک مستقل مضمون پڑھا تھا، جس میں موافق و مخالف دونوں پہلو اختیار کئے گئے تھے، سردست فریقین کے دلائل یاد نہیں، البتہ اتنا یاد آتا ہے کہ نتیجہ میں اخبار نویسوں کو ادیبوں اور انشا پردازوں کے گروہ میں شامل کیا گیا تھا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اخبار کا وہ حصہ جو خبروں اور تاروں سے تعلق رکھتا ہے، وہ تو سرے سے نظم و نثر کسی صنف میں بھی داخل نہیں، اس لئے اگر کوئی اخبار نویس اس قسم کی خبروں کے جمع کر دینے سے اپنے آپ کو ادیب اور انشا پرداز سمجھتا ہے تو وہ حماقت میں مبتلا ہے، البتہ اخباروں میں جو سیاسی، تمدنی، تبلیغی، تعلیمی اور مذہبی مضامین لکھے جاتے ہیں ان کی بنا پر ایک اخبار نویس ادیبوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے، موجودہ دور میں اس حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ظفر علی خاں، پنجاب کے مہر و سالک اور یوپی کے اخبار مدینہ کے بعض اڈیٹروں نے اخبار نویسی کا معیار بہت بلند کر دیا ہے،

(۳) نثر کے بعد خود نثار کی ذات ہمارے سامنے آتی ہے، یعنی یہ کہ خود ادیب اور انشا پرداز کو کن اوصاف کا جامع ہونا چاہئے، عربی علم ادب کی کتابوں میں اس کے ایک ایک جزئیہ پر بحثیں کی گئی ہیں، مثلاً ادیب کا قلم کیسا ہونا چاہئے؟ کاغذ کیسا ہونا چاہئے؟ روشنائی کیسی ہونی چاہئے؟ اس کا خط کیسا ہونا چاہئے؟ اور بعض اوقات ان سے اہم نتائج بھی نکلتے ہیں، جو لوگ اخبار یا رسالہ نکالتے ہیں، وہ بد خط مضمون نگاروں کے اس ادبی نقص سے بیحد پریشان ہوتے ہیں، لیکن ان اوصاف میں سب سے اہم وصف یہ ہے کہ ادیب کو نہایت وسیع النظر اور ہر علم و فن کا ماہر ہونا چاہئے، صاحب مثل السائر نے لکھا ہے کہ ایک انشا پرداز کو ہر علم اور ہر فن سے تعلق رکھنا چاہئے، یہاں تک کہ اس کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عورتوں کے حلقۂ ماتم میں کیا کہہ کر رویا جاتا ہے، مشاطہ جب دلہن کو سنوارتی ہے، تو کون سے فقرے بولتی ہے؟ بازار میں پکار پکار کر سودا بیچنے والے کیا کہتے ہیں؟ ایک ادیب یا ایک انشا پرداز ان طریقوں سے جو سرمایۂ معلومات فراہم کرتا ہے وہ اس کا گم شدہ مال ہوتا ہے جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ حکمت کی بات ایک مسلمان کا گم شدہ مال ہے جب وہ اس کو مل جاتا ہے تو وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہو جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہل حکمت حکمت کی بات ایسے لوگوں سے بھی سیکھ سکتے ہیں، جو خود حکیم نہیں ہوتے، بقول سعدی "ادب از کہ آموختی، گفت از بے ادباں"

اسی طرح ایک انشا پرداز، انشا پردازی کے نکتے ان لوگوں سے بھی سیکھ سکتا ہے، جو خود انشا پرداز نہیں ہوتے، عربیت کے ایک بہت بڑے امام قصہ گویوں اور شعبدہ بازوں کے حلقہ میں جا جا کر شریک ہوتے تھے، اس پر لوگوں نے ان کو سخت ملامت کی کہ آپ اتنے بڑے امام ہو کر اس قسم کی ذلیل صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں اس لئے شریک ہوتا ہوں کہ ان لوگوں کی ہذیان سرائی میں بھی بعض ایسے لطیف انشا پردازانہ

فقرے شامل ہوتے ہیں، جو ہمارے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتے، صاحب مثل السائر نے اس قسم کے بہت سے انشا پردازانہ فقرے جمع کئے ہیں، جن سے اس نے اپنی تحریروں میں آب و رنگ پیدا کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ ایک عورت جس کا پہلوٹی کا لڑکا مر گیا تھا یہ کہہ کر رو رہی تھی کہ میرے رنج و غم کا کیا ٹھکانا یہ پہلی اشرفی تھی جو میری جیب میں پڑی تھی، میں نے اس فقرہ کو یاد کر لیا اور جب میرے ایک دوست کا پہلوٹی کا لڑکا مر گیا تو میں نے تعزیت نامہ میں کسی قدر تغیر کے ساتھ اس فقرہ کو شامل کر لیا،

اس نے ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے کہ انشا پردازی سیکھنے کے کیا کیا طریقے ہیں، اور اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ بہت سے نادر مضامین بازاری اور پیشہ ور لوگوں کے ذہن میں بھی آسکتے ہیں، البتہ وہ ان کو مناسب الفاظ میں ادا نہیں کر سکتے، بغداد میں چند معمولی آدمی رمضان میں محلوں میں گھوم گھوم کر سحری کھانے کے لئے موزوں الفاظ میں جو شعر کے مثل ہوتے ہیں لوگوں کو جگاتے ہیں، میں نے اس قسم کے فقرے سنے تو وہ نہایت نادر معانی پر مشتمل تھے، البتہ جن الفاظ میں وہ ادا کئے گئے تھے وہ ان کے لئے موزوں نہ تھے، جاحظ نے لکھا ہے کہ مضامین تو بازاروں میں پڑے ہوئے ملتے ہیں، البتہ موزوں الفاظ میں ان کا ادا کرنا ایک ادیب یا شاعر کا اصلی کام ہے،

بہر حال وسعتِ نظر اور جامعیت ایک انشا پرداز کا اصلی وصف ہے، شعر تو ہر شخص کہہ سکتا ہے، لیکن نثر صرف علما ہی لکھ سکتے ہیں، موجودہ دور کے انشا پردازوں میں اس حیثیت سے مولانا شبلی کا کوئی حریف نہیں، اس وقت دوسرے مصنف اور مضمون نگار بھی اس وصف میں ترقی کر رہے ہیں، لیکن اصلی شاہراہ مولانا شبلی ہی نے قائم کی ہے اور دوسرے لوگ انہی کی تقلید کر رہے ہیں، اس وقت جن علما نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ

اختیار کیا ہے وہ اس وصف کے لحاظ سے جدید تعلیم یافتہ گروہ سے گوے سبقت لے گئے ہیں، اگر جدید تعلیم یافتہ گروہ ان کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو انگریزی زبان کے علاوہ فرنچ اور جرمن زبان بھی سیکھنی چاہئے، حال میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک عمدہ کتاب ایران بعہد ساسانیان شائع ہوئی ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے فرنچ زبان سے اردو میں کیا ہے جو جدید گروہ کے لئے شمع راہ ہو سکتی ہے،

اس سے پہلے بھی دو عمدہ کتابیں یعنی تمدن عرب اور تمدن ہند کا ترجمہ فرنچ زبان سے کیا جا چکا ہے، بعض کتابیں مثلاً روح الاجتماع اور انقلاب الامم اگرچہ عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں، لیکن خود ان کے عربی ترجمے فرنچ زبان سے کئے گئے ہیں، انگریزی سے بھی بعض عمدہ کتابیں مثلاً تاریخ اخلاق یورپ اور معرکۂ مذہب و سائنس اردو میں نقل و ترجمہ کے ذریعہ سے آئی ہیں، میرے خیال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ جو عربی اور فارسی نہیں جانتا اگر انگریزی زبان کی بہترین کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کرے تو ہمارے ادبی ذخیرہ میں بڑا قیمتی اضافہ ہو سکتا ہے، غلطی سے ترجمہ کے کام کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، اور اس کو ایک حقیر علمی یا ادبی خدمت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ علمی اور ادبی حیثیت سے دو ہی کام سب سے زیادہ مشکل اور سب سے زیادہ اہم ہیں، ایک تو بچوں کو سبق پڑھانا اور دوسرے ترجمہ کرنا، اس لئے جو لوگ ترجمہ کو اور تخیل تصنیفات سے کم رتبہ سمجھتے ہیں، وہ دماغی عجب و خود بینی میں مبتلا ہیں، مسلمانوں میں علم و فن کی ابتدا اور اشاعت یونانی کتابوں کے ترجموں ہی سے ہوئی؛

۴۔ سب سے اخیر میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ اس وقت اردو زبان میں تصنیفات و تالیفات کا جو ذخیرہ پیدا ہو رہا ہے، اس کی ادبی، علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی قدر و قیمت کیا ہے، اور اس وقت ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں کا رجحان کس طرف ہے؟

یہ ایک طویل بحث ہے، جس کی گنجائش اس مختصر تقریر میں نہیں ہے، اس لئے میں اس کو نظرانداز کرتا ہوں، البتہ لفظی اور معنوی حیثیت سے میں نے ادب کا جو معیار قائم کر دیا ہے، اس کے مطابق ہر شخص خود اپنی فہم و بصیرت سے موجودہ سرمایۂ علم و ادب کا جائزہ لے سکتا ہے،

اب میں اپنی ناچیز تقریر کو ختم کرتا ہوں اور آپ لوگوں کا شکرگذار ہوں کہ آپ نے میرے نامانوس خیالات کو نہایت متانت، سنجیدگی اور دلچسپی کے ساتھ سنا، لیکن میری یہ شکرگذاری آپ کی پسندیدگی ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ اگر آپ نے میرے ان خیالات کو ناپسند بھی کیا ہے، تب بھی میں آپ کا شکرگذار ہوں، کیونکہ اس سے بہرحال ایک مخالف ادبی معیار قائم ہوگا، اور ہر انصاف پسند شخص دونوں معیاروں کا موازنہ کر کے ایک معتدل معیار قائم کر سکے گا،

وھذا اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

تصحیح

گذشتہ مہینہ کے معارف ص ۷۶، ۱۴ سطر میں کتابت کی غلطی سے یہ عبارت چھپ گئی ہے "اور اللہ تعالیٰ نے بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں مثلاً توحید رسالت اور آخرت وغیرہ پر یقین دلانے کے لئے قسم کھائی ہے"

صحیح عبارت یہ ہے "اور اللہ تعالیٰ نے بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قسم کھائی ہے، اور جن چیزوں مثلاً توحید رسالت اور آخرت وغیرہ پر یقین دلانے کے لئے قسم کھائی ہے"

یادِ پاستاں

از

جنابؔ لوی مقبول احمد صاحب صمدنی

اگست کے ایک شذرہ نے مئی کے معارف پر توجہ دلائی اور مئی کے پرچہ نے چند قابل تلاش تاریخوں کی طرف (صفحات ۳۹۲ و ۳۹۳) بخشی خواجہ نظام الدین احمد کی تصانیف اور حالات کچھ اس عاجز ہیچ مداں نے بھی پڑھے تھے، کبھی ایک مستقل و مکمل، فاضلانہ تحریر ایک بدایونی محقق و نقاد کی بھی دیکھی تھی، میرا ذہن اُس عالمانہ و واقف کارانہ اور جامع الجہات مقالہ سے بھی خالی نہیں، جو محترمی سید احمد اللہ قادری صاحب حیدر آبادی کے خامۂ مشکیں رقم سے ۱۹۳۱ء میں نکلا تھا اور سالِ مذکور کے اگست کے معارف میں بصیرت افروز ہوا، اس میں معلومات کے اصل ذرائع یعنی فارسی تاریخوں کے اقتباسات و انتخابات بھی موجود ہیں، حوالہ کی کتابیں بھی وہی ہیں جو ہمارے واجب الادب ڈاکٹر بینی پرشاد نے نقل فرمائی ہیں، ایک دو ناموں میں خفیف سا فرق ہے، ہو سکا تو فاضل ڈاکٹر کے انگریزی آرٹیکل اور ان دونوں تاریخی مقالوں پر یکجائی نظر ڈال کر کسی وقت تفصیل سے عرض کروں گا، سردست ع

ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچم کہ دراز است

بالفعل چند تاریخوں کے بارہ میں گذارش کرنا چاہتا ہوں،

(۱) تاریخ محمدی، نمبر ۱۷ - ڈاکٹر صاحب کی قیاس کردہ یا متخیلہ و مظنونہ تاریخ محمد بہادر خانی

کا مجھ علم نہیں، کم از کم اس وقت یاد نہیں، ایک نام کی کتابیں متعدد ہوتی ہیں، اس لئے اگر یہ کتاب تاریخ محمدی وہی ہے جو میں سمجھ رہا ہوں تو وہ نایاب نہیں، کمیاب کہہ سکتے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ معظمی سید محمود علی رضوی صاحب رئیس چھپرامئو کے یہاں موجود ہے، ڈوڑھ سو برس پہلے یہی نسخہ مولانا مفتی محمد ولی اللہ فرخ آبادی کی ملک تھا، مفتی صاحب نے اس کو اپنے عظیم المنزلت کثیر المنفعت مدرسہ فخر المدارس و ربیع المفاخر کے لئے وقف فرما دیا تھا، چالیس پینتالیس سال ہوئے، نامور مستشرق اور ہندوستان کے عہد اسلامی کے کامیاب مورخ و مصنف ولیم آئروین (WILLIAM IRVINE) کی فرمایش و درخواست سے میرے زیرِ اہتمام اس کی نقل کرا کے انگلستان بھیجی گئی تھی، ریو کی فہرست میری نگاہوں سے دور ہے، نہ کوئی اور لمبی چوڑی فہرست میرے پاس ہے جس سے وثوق کے ساتھ کچھ کہہ سکوں، ممکن ہے کہ آئروین صاحب کے دیگر علمی خزائن و مخطوطات و متروکات کے ساتھ یہ نقل بھی برٹش میوزیم میں پہنچ گئی ہو، یا ان کی دختر نیک اختر مارگریٹ ایل آئروین صاحبہ (MARGARET.L. IRVINE) کے پاس محفوظ ہو جو خود بھی صاحبِ تصنیف ہیں اور ستھرا علمی ذوق رکھتی ہیں،

یہ ضخیم و حجیم کتاب دو جلدوں میں ہے، پہلی ہی جلد جہازی تقطیع کے ۱۲۳۴ صفحات پر آئی ہے، اور پھر بھی آخر میں کچھ چھوٹا ہوا ہے، جس کا سراغ "ترک" کے عدم ارتباط اور عبارت کے منقطع رہ جانے سے چلتا ہے، مصنفِ علام نے اپنا نام "احقر العباد ذرۂ ناچیز فقر نہاد محمد بن رستم بن قباد احسن اللہ مآلہ وما لہما فی المعاد" بتایا ہے، اس کے آگے بالکل خاموش ہے، نہ اپنے موطن و مسکن کا نام لیتا ہے نہ مشرب و مذہب کا ذکر کرتا ہے، وہ ہم ایسا قوم پرست یا ملک کو بدنام کرنے والا یا متعصب و دیندار معلوم نہیں ہوتا، ہر شیعہ اور شیعۂ امامیہ کا نام احترام کے ساتھ لیتا ہے، صرف ابن علقمی ایسے "رافضی" سے جلا ہوا ہے، ابوالرضا بن کرپال الہندی یا رتن بن دھادیو بن باسدیو

(متوفی ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۶ء) ایسے عمر رسیدہ بزرگوار سے بھی کوئی عقیدت نہیں رکھتا، مورخانہ انداز سے اہلِ حدیث کے اقوال کا حوالہ دیتا ہوا گذر جاتا ہے[1]،

---

[1] آئین اکبری (جلد سوم، صفحہ ۱۶۰) میں شیخ بابا رتن پسر نصر ترمذی، ابوالرضا کنیت کے حالات بہ قدرِ ضرورت تفصیل سے لکھے ہیں، بابا کا دعویٰ تھا کہ وہ بہ زمانۂ جاہلیت ترندہ میں پیدا ہوئے، حجاز تشریف لے گئے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، دنیا بھر میں گھوم کر پھر ہندوستان آ گئے، بہت سے لوگ ان کے دعووں اور باتوں کو مانتے ہیں، مگر ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اُن کی درازی عمر کے متعلق ان کے اقوال کو باور نہیں کرتا، (۷۰۰ھ م ۱۳۰۱ء) میں ترندہ میں وفات پائی، وہیں مدفون ہیں، شیخ ابن حجر عسقلانی، مجدالدین فیروزآبادی، شیخ علاء الدولہ سمنانی، خواجہ محمد پارسا وغیرہم ان کی بزرگی و کرامت کے قائل ہیں،

قاضی نوراللہ شوستری مجالس المومنین (صفحہ ۳۰۹) میں بابا کا نام بڑے ادب سے لیتے اور بکمال تعظیم و تکریم سے ذکر کرتے ہیں، بقول قاضی صاحب، ابوالرضا شیعی مذہب تھے، فضائلِ اہل بیت اور مدح شیعیان میں اکثر احادیث ان سے مروی ہیں، فضیلتِ روایات یہ کہ بلا واسطہ رسول مقبول صلعم سے پہنچی تھیں، ساتھ ہی تنبیہاً ارشاد فرماتے ہیں کہ علمائے اہلسنت وجماعت خصوصاً حشویہ ارباب حدیث ایشاں مانند ذہبی کہ نخاسی نحس روا ندود متعصب مردود بودہ در ابوالرضا مذکور قدح موفور نمودہ اند، تا آنکہ ذہبی در کتاب میزان نا مستقیم خود غایت تعصب بکار بردہ و اورا کذاب و دجال شمردہ" (شیعہ حشویہ سے کم درجہ کے محدثین کو مراد لیتے ہیں (مقالات شبلی صفحہ ۳ اول نوٹ)

نواب صدیق حسن خاں تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار میں لکھتے ہیں کہ شیخ رضی الدین لالاوی بھی ابوالرضا رتن کا ماننا اور اس سلسلہ میں بعض مشائخ کے اقوال نقل کرتے ہیں، مگر رتن ہندی کا عمر دراز پانا اور صحبت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشرف ہونا محض جھوٹ بکنا ہے، اہل حدیث کو بھی اس سے انکار ہے، وہ اس کو وضاع (بات گڑھنے والا) کذاب (نہایت جھوٹا) دجال (بڑا دروغگو) بتاتے ہیں، اور یہی سچی بات ہے، انکار سے مراد صحبت نبیؐ سے انکار ہے نہ کہ اس کے وجود سے، کیونکہ صاحب قاموس

مؤلف اپنے باپ دادا کے نام سے عجمی النسل معلوم ہوتا ہے، لیکن اس نے صرف گیارہ صفحے رائج الوقت سادہ و رواں فارسی میں سیاہ کئے ہیں، باقی پوری کتاب عربی میں ہے، کچھ اپنی انشا ہے، کچھ منقولاتِ غیر اور تلخیصات ہیں، ترتیب باعتبار سنین رکھی گئی ہے، ہر صدی، ہر قرن، ہر برس کے عمائد، ممتاز علماء و فضلاء، مشائخ کبار، صوفیۂ صافیہ، بزرگانِ ملت و سلاسل، مشاہیر شعراء در جملہ اہلِ فنون و ہنر کو اُن کے سالِ وفات کی رعایت سے درج کیا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے اس میں ایجاز و اختصار ملحوظ رکھا ہے۔ فرماتے ہیں،

تاریخ جہاں کہ قصۂ خورد و کلاں درج است درو چہ شیراں چہ یلاں
در ہر ورقش بخواں کہ فی عام کذا قد مات فلاں بن فلاں بن فلاں

مؤلف نے ان تاریخی کتابوں کی فہرست بھی دے دی ہے جن سے اس تاریخ محمدی کی تالیف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶) شیخ مجدالدین فیروزآبادی اس کو اپنی آنکھ سے دیکھنا بیان کرتے ہیں، ن۔ صوفی، رضی الدین علی لالاوی، متوفی ۶۴۲ھ، مدفون غزنی؛

تقریباً یہی کیفیت سرباتک بادشاہ ہند کی بھی ہے، ایسے ہی اختلافات ہیں، اصابہ فی تمییز اسماء الصحابہ میں جو علم رجال میں انہی حافظ احمد بن حجر عسقلانی کی مستند و ضخیم تالیف ہے، نیز کتاب الذیل میں اسحاق بن ابراہیم طوسی جن کی عمر ستانوے سال کی تھی، اور اس سرباتک کی ملاقات و گفتگو کا حال مرقوم ہے، مگر اہل تحقیق عموماً اور مسبوق الذکر امام ذہبی خصوصاً جو رجالی بھی ہیں، محدث بھی، عظیم الشان مورخ و مصنف بھی، اپنی تجرید میں ان کی دیا یوں کہئے کہ) سرباتک کی باتوں کو "کذب واضح" سے تعبیر فرماتے ہیں (حیات جلیل حصہ دوم صفحہ ۱۸۷)

مسٹر بیل (W.T. BEALE) (ڈکشنری صفحہ ۱۹) دولت شاہ کی روایت اور بابا رتن کا چودہ سو برس کی عمر پانا اور تیرھویں صدی مسیحی کے آغاز میں فوت ہونا نقل کرتے ہیں، زبدۃ الکلام فی مشاہیر الاسلام کے شیعہ مؤلف نے اور بھی ناطرفدارانہ و بے نیازانہ روش اختیار کی ہے، فرماتے ہیں کہ "رتن ہندی محدث کی عمر بعض نے چھ سو سال اور بعض نے ۷۰۰ سال لکھی ہے، مسلمان ہو گیا تھا" (صفحہ ۶۷)

وترتیب میں مددلی تھی، ان کا شمار ساٹھ سے متجاوز ہے، وجہ تسمیہ...."جامع ایں اوراقِ پریشاں

نیز بہ اسم سامی حضرت خیرالانامی سعادت تسمی دارد، ایں کتاب والا انتساب را بدیں مناسبت

تاریخ محمدی نام نہادہ شد"۔

مرنے والوں کے نام گنانے اور مختصر حالات بتا دینے کے سوا بعض بعض سنین (برسوں)

کے ذیل میں اس سال کے اہم وضروری واقعات وحوادث بھی درج کر دیئے ہیں، مؤلف کی وسعتِ

نظر اور کتاب کی جامعیت کی شہادت کے لئے اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اس میں ہندو امرا

اور راجاؤں کے سالہائے ممات وحالاتِ حیات اسی طرح ملتے ہیں جیسے مسلمانوں کے، بیٹے

یا جانشین کا بیان کرتے وقت باپ یا پیش رو کے تذکرہ (مندرجۂ کتاب ہذا بحوالۂ سنہ) کا حوالہ

دیتے جانا ناگزیر سمجھا گیا ہے،

بعض تاریخ نویس اس تاریخ محمدی کے مصنف کو صرف مرزا محمد کے نام سے یاد کرتے ہیں،

محمد رستم اپنی کتاب سے قدیم تر کسی تاریخ محمدی کا نام نہیں لیتا، قیاس چاہتا ہے کہ یہی تاریخ

محمدی ہوگی جس کا حوالہ طبقات اکبری (مشہور بہ تاریخ نظامی) میں دیا گیا ہے،

(۲) تاریخ نمبر ۲۵ کا نام صفحہ ۳۹۲ پر وقائع بابری اور صفحہ ۳۹۳ پر واقعات بابری لکھا ہے،

حقیقت خدا جانے یا اس کتاب کے لکھنے والے جانیں، میرے نزدیک لغوی حیثیت سے دونوں

میں کوئی فرق نہیں، تاریخوں کے نام کے ساتھ وقائع اور واقعات دونوں کا استعمال وانضمام

دیکھا جاتا ہے، دونوں کے معنی بھی قریبًا یکساں ہیں، وقائع بہ معنی حوادث واحوال، لڑائیوں

کی خبریں، روداد یں، یہ "وقعۃ" بہ معنی فتنہ وقتل کی جمع ہے، واقعہ کی جمع واقعات ہے، واقعہ جنگ

حادثہ، سختی وغیرہ کو کہتے ہیں، ایک معنی خواب بھی ہے،

باقی حال۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ واقعات بابری سے مراد تزکِ بابری

ہے، (بابر کے خود نوشت سوانح) تزک کو بابر نے ترکی زبان اور خطِ طغرا میں لکھا تھا، اس کی

راست بیانی، کتاب کی سلاستِ زبان، عبارت کی روانی، فصاحت ولطافت نکتہ رس ودقیقہ

شناس اربابِ علم سے خراجِ تحسین لیتی رہی ہے، مسٹر بیل کا یہی ایک جملہ کیا کم وقیع و وزن دار ہے

BABAR WROTE HIS OWN LIFE WITH SUCH ELEGANCE AND TRUTH, THAT THE PERFORMANCE IS UNIVERSALLY ADMIRED.

نواب صدر یار جنگ بہادر نے اس اظہار خیال کو دو لفظوں میں یوں ادا کیا ہے کہ "تمام

عالم نے اس کتاب کی تعریف کی ہے (تذکرۂ بابر، صفحہ ۷۰)

اسی تزک کا اصل ترکی چغتائی[2] سے انگریزی میں ترجمہ، فاضل مشرق نواز انگریزوں مسٹر

لیڈن (JOHN LEYDEN) اور ارسکن (WILLIAM ERSKINE) کے قلم سے ہو کر بدت

ہوئی شائع ہوا تھا، (بیل کی ڈکشنری صفحہ ۶۲ ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) میں اکبر کے حکم سے فارسی کا ترجمہ

مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے کیا تھا[3]، یادش بخیر۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں اسی واقعات بابری کا

---

[1] اورنیٹل بائیوگرافیکل ڈکشنری، صفحہ ۶۲ [2] چغتائی یا جغتائی اب تک ملک فرغانہ کی زبان ہے، بیابانوں،

صحراؤں، دیہات اور شہروں میں اس کا یکساں دور دورہ ہے، یہ چغتائی خاں پسر چنگیز خاں سے منسوب ہے؛

جس کی نسل کوہِ انوغ تاغ تک پھیلی ہوئی ہے (میموائرس آف بابر، مصحح سر لوکاس کنگ، ۱۹۲۱ء،

صفحہ ۲) ترکی اور مغلی دو جدا جدا زبانیں ان اطراف میں تھیں، چغتائی ترکوں کو کبھی گوارا نہ ہوا کہ ان کی زبان

مغلی کہدی جائے، میجر ڈیوی (MAJOR DAVY) جیسے وسیع النظر زبان آشنا نے دونوں

کو خلط ملط کر دینے میں غلطی کی ہے، تیمور کی وفات سے بابر تک کا زمانہ ترکی لٹریچر کے واسطے عہد زریں سمجھا جاتا

ہے (ایضاً صفحہ ۲۵) آجکل ایران اور میدان جنگ کی خبروں اور تاروں میں جس چیز کا نام آتا ہے وہ جغتائی پہاڑ

کا سلسلہ ہے، جس کے قریب سبزوار وغیرہ مقامات واقع ہیں [3] واقعات کا ترجمہ ۹۹۸ھ میں ہوا، طبقات اکبری

اس کے دو سال بعد یعنی ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں تصنیف ہوئی، قیاس کہتا ہے کہ یہی ترجمہ بخشی صاحب کے پیش نظر تھا، جو

خانخاناں کے خواجہ تاش اور اسی صوبۂ گجرات کے بخشی تھے جس کا گورنر خانخاناں تھا،

ایک نہایت پُرتکلف نسخہ آگرہ کالج کی لائبریری میں موجود تھا، جو ۱۸۵۳ء یعنی آنریبل جیمس ٹامسن (JA MES THOMASON) لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی کے انتقال تک ان کا مملوکہ رہا تھا، اس کے سرورق پر شہاب الدین شاہ جہاں کی یادداشت بہ اضافہ "صاحب قرانِ ثانی" تحریر تھی[1]، اس کے بعض الفاظ سے خالی الذہن قاریوں کو یہ غلط خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ شاہجہاں نے یہ پوری نقل اصل کتاب سے خود کی ہے، حالانکہ جس معمولی بلکہ بھدے طرز میں یہ یادداشت تھی وہ متن (اصل کتاب) کی منشیانہ پختہ نگارش وقلم کاری سے کلیۃً مختلف اور جدا تھی، اور بداہۃً اس نظریہ کی تردید کرتی تھی،

نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذرا لیکن واقعاتِ بابری کے اُس نادر نسخہ کی شکل وہیئت اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے، کاغذ نہایت خوش رنگ، خوشنما، چمکتا ہوا، دیدہ زیب خطاطی کا عجیب وغریب نمونہ، بغایت نظر فریب، قرآن پاک کی آیات سنہرے حروف میں لکھی ہیں، باقی کتاب جلی روشن سیاہی اور خونابہ نشاں شنجرف سے تحریر ہے، اس میں کم وبیش پوری تقطیع کی پچاس تصویریں پرانی انگریزی طرز کی صناعی سے کچھ کچھ مانند ومماثل تھیں، لیکن ان تصویروں اوران سے ملتی جلتی افرنگی تصویروں میں زمین وآسمان کا فرق تھا، جس کا اعتراف خود بالغ نظر اور واقف فن انگریز کرتے تھے[2]، ان میں رزم وبزم دونوں کی اعلیٰ شان اور دستکاری کی انتہائی نزاکت وبرتری

---

[1] صاحب قرانِ ثانی، شاہجہان اول کا لقب تھا، اس کی ولادت حسب تخریج اہل نجوم زہرہ ومشتری کے قران (اکٹھا ہونے) کے وقت ہوئی تھی، صاحبقرانِ اول، امیر تیمور تھا۔

[2] مسٹر ای بی ہیول رقم طراز ہیں کہ "یورپ کی تصویریں بے کیفی سی معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ اہل یورپ صرف حسنِ مادی کے شیدا تھے، ہندوستانی صورت کشی حقیقی کیفیات اور ملکوتی جذبات کی ترجمان ہوتی ہے" (انڈین اسکلپچرس اینڈ پینٹنگز صفحہ ۸۰۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب از مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا، مترجمہ منشی پریم چند، صفحہ ۲۳۴)

نمودار تھی، ترکستان میں بابر کی ابتدائی لشکرکشیاں اور معرکے، تاتاریوں اور ازبکوں سے مقابلے بعد کے محاصرے، پانی پت میں ابراہیم لودی سے جنگ وپیکار، اس کی شکست، گریز وتعاقب، نیز طرح طرح سے دربار وجلوس کا اہتمام واحتشام، بزم نشاط کا فوری انعقاد، ہنگامی انتظامات، رفقائے برہنہ شمشیر، جوانانِ تیغ بکف کی برسرِ جنگ مےگساریاں، بادہ نوشیاں، بالآخر توبہ وانابت کی توفیق، بابر کا مناجات کے لئے ہاتھ اٹھانا، جام وصہبا کو خیرباد کہنا، خم وسبو کو چور چور کردینا، بادۂ ناب کو جوئے آب کی طرح بہا دینا یا سرکہ بنا لینا، اوراس کی بدولت سنگ رام سنگھ رانائے چتوڑ پر فتح پانا، غرض کونسا منظر تھا جو ان تصاویر سے نگاہ کے سامنے نہیں آجاتا تھا، خود بابر کی بھی شبیہ تھی، بالکل ہو بہو اور موبمو، اصل کے مطابق، بیضوی چہرہ، چھوٹی چھوٹی کالی کالی مونچھیں، نوکیلی نیچی داڑھی، وسط ایشیا اور ہندوستان کے جانور، وہاں کی عمارات، تاتاریوں اور اہلِ ہند کی وضع وقطع، زی ولباس رسم ورواج، اسلحۂ جنگ، آتش باریاں، خود، زرہ اور اور ہتھیار، سواروں کی آن بان، گھوڑوں کی شان اور ٹھاٹھ، تمام باتیں اور کیفیتیں، عیش وطرب کی ہوں یا پیکار ونبرد کی، کمال راست بازی وحق پژوہی کے ساتھ لفظاً ومعنیً، اوراقِ کتاب پر جلوہ افروز پائی جاتی تھیں، تصویروں نے ان میں جان ڈال دی تھی، کونسی چیز تھی جس پر لکھنے والے کی نگاہِ تیز رس نہیں پہنچی یا جس کو قلم اور مو قلم نے چھوڑ دیا ہو، ترکمانوں کی چھدری چھدری مختصر داڑھیاں اور بھینگی آنکھیں بھی ان کی زد سے بچ نہ سکیں، نبض شناس دیدہ ور انگریزوں نے اس نادر چیز کو بیش بہا یا خود ان ہی کی زبان میں (PRICE LESS) "بے بہا" لکھا ہے، اکبرآباد کی یادگار ہائے پاستان اور سلاطینِ مغل کے علمی وادبی سرمایوں میں یہ منتخب ترین ولاجواب شمار کی جاتی تھی، اور یہ رائے بالکل حق بجانب تھی، مسٹر ڈنکن (E.A. DUNCAN) اور مسٹر کین (KEENE) نے آگرہ ہینڈبک میں ایک مستقل باب ضمیمہ الف کے عنوان سے اس کے نذر کیا تھا، پھر وہ کونسا جہاں گرد سیاح تھا جو

جو اکبرآباد آتا ہو اور اس نادر ترین شے کی زیارت سے مشرف نہ ہو جاتا ہو،

استدراک، وہی نام کا مسئلہ، ہندوستان زا افرنگی نژاد مسٹر بیل بھی واقعات بابری بتاتے (ڈکشنری صفحہ ۸) اور آئین اکبری کے ترجمۂ انگریزی (جلد اول، صفحہ ۳۴۴) کا حوالہ دیتے ہیں، ابوالفضل علامی کی عبارت یہ ہے،

دواقعات حضرت گیتی ستانی کہ دستور العمل کار آگہی ست، میرزا خانخانان از ترکی بہ فرس آورد (جلد اول، صفحہ ۷۶)

ملا قاسم ہندو شاہ نے بھی واقعات بتایا ہے (فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۱۱، نولکشوری) مگر ایک دوسرے موقع پر سلسلۂ کلام میں یہ بھی کہہ گیا ہے کہ "وقائع سلطنت خود را در ترکی بہ نوعے نوشتہ کہ فصحا قبول دارند"۔ . . . . یہاں پر وقائع اور واقعات کا فرق اور دونوں میں فرق کرنے کی ضرورت ظاہر ہے،

خانِ آرزو نے بھی تذکرۂ مجمع النفائس میں "بایسنغر کے ذکر میں واقعات بابری کا نام لیا ہے، جس سے آرزو نے استفادہ کیا تھا،

اپنے عنفوانِ شباب میں ایک ہونہار طالب علم نے جواب دین و دنیا، دولت و امارت، علم و فضل کے جامع ہیں، جو فخرِ قوم مخدوم ملت ہیں، جو مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام نامی اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے خطاب گرامی سے عالمگیر شہرت رکھتے ہیں، اسی واقعات اکبری کی نقل اسی کالج والے نسخہ سے حاصل کی تھی، اور جو امید ہے کہ حبیب گنج کی بے مثل لائبریری میں ہنوز محفوظ ہوگی، تذکرۂ بابر لکھتے وقت یہ نقل بھی پیشِ نظر تھی، صرف ایک ہی نام واقعات بابری اس میں بھی ملتا ہے، (تذکرہ صفحات ا و ۶۱ و ۷۳ و ۷۷)

موجودہ دور کے قابل و کثیر التصانیف مورخ مولوی سعید احمد مارہروی اسی کی نسبت فرماتے ہیں کہ واقعات بابری کا یہ قلمی باتصاویر نسخہ نہایت نایاب و بیش بہا ہے (مرقع اکبرآباد، صفحہ ۱۳۶، مطبوعہ آگرہ ۱۳۴۹ھ) اسی سلسلہ میں اصل ترکی تورک کا (صفحہ ۲۱۰) پر حوالہ دیتے ہیں،

وقائع۔ صرف منشی دوار کا پرشاد افق نے ترجمۂ راجستھانِ ٹاڈ میں بابر کی توبہ و استغفار کے سلسلہ میں وقائع بابری نام لیا ہے (اشاعت پنجم، صفحہ ۵۶۹)

مدت سے ہمارے ملک اور ہماری انشاء پر نظم و شعر کے بادل بہت گھرے چھائے ہوئے ہیں، ان کے پھٹنے اور چھٹنے میں زمانہ کا ہاتھ بے کار ثابت ہوا ہے، جس بابرکت سرزمین نے اقبال و ٹیگور سے معنی آفریں اور رجز خواں پیدا کئے ہوں، قوم کو چونکا دینے والے، دلوں کو ہلا دینے والے انسان جس خاکِ پاک سے اٹھے ہوں، بے شبہہ وہ تمام فخر و مباہات کی مستحق و مجاز ہے، مگر شکوہ یہ ہے کہ ہمارے تذکرہ نویس بلکہ بعض اوقات دعویدارانِ تاریخ نگاری بھی سخن سرائی اور اشعار خوانی کی رو میں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ اس میدان میں جو پہلوان آتا ہے وہ خم ٹھونک کر شہنشاہ بابر کی فقط ثنا خوانی اور لفاظانہ مدح گوئی کرتا، اس کے چار چھ شعر فارسی کے پڑھ کر چلا جاتا ہے، پھر آگے خاموشی ہی خاموشی رہ جاتی ہے، اس کی انشا پردازی، زورِ قلم، قوتِ تحریر کا اعتراف و تحسین، ایسے معاملات، بیرونی سیاحوں، غیر اقوام کے تمیزدار لکھنے والوں کے لئے اٹھا رکھتا ہے، میر حسین دوست سنبھلی صاحب تذکرہ حسینی (صفحہ ۹۳) اسکو ایک جامع سند بھی دیتا ہے کہ "محمد بابر قلندر بادشاہ در شجاعت و عدالت و سخاوت و فصاحت گوے از سلاطین زماں ربودہ"۔ مگر "تزک" یا "واقعات" کا نام لے کر گناہ گار بننا گوارا نہیں کرتا،

راجہ درگا پرشاد نے گلستانِ ہند (دفتر سوم، صفحہ ۲۱۳) میں یہی گریز ملحوظ رکھا ہے،

بخلاف ان بزرگوں کے، یورپ کا ہر نظر باز، ایشیا اور اہل ایشیا سے نفرت نہ کرنے والا بابر کی تحریرات ہی کی بہ غایت مدحت و ثنا کرتا ہے، کرنیل ٹاڈ اپنی تاریخ کی جلد دوم (صفحہ ۶، مطبوعہ ۱۸۹۴ء)

کی خود نوشت سوانحعمری عجیب کارآمد و قیمتی چیز ہے ...“
میں فرماتے ہیں کہ ”بابر.....
اسی تاریخ ناڈ کے فاضل مرتب کنندگان نے اس ترک کی تعریف میں ورق کے ورق سیاہ
کئے ہیں اور صفحہ ۲۵۴ پر اس کے بارہ میں ایک بڑا زوردار نوٹ اور اپنا خیالِ بلند قلمبند کیا ہے،
خلاصہ یہ ہے کہ میموائرس آف بابر کے لئے ادب و انشا کی دنیا مسٹر ارسکن کی کمال احسان مند و
منت پذیر رہے گی، یہ ایک بے مثل کتاب ہے، قطعاً اوریجنل، بالکل نوایجاد، نادر قدر و قیمت کی
چیز، اس کی طویل و مفید تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات اس قطعۂ زمین سے تعلق رکھتی ہیں جو ربع
مسکون کا دلچسپ ترین حصہ ہے۔“

تزک کے فرانسیسی مترجم پاویل دی کورٹیل (POWELL DE COURTEILLE) نے اسکی
مقبولیت اور عام پسند ہونے کی یہی دلیل کافی سمجھی ہے کہ اس کے تین ترجمے فارسی میں ہو چکے ہیں
(میموائرس آف بابر از لائیڈن و لوکاس کنگ، تمہید انگریزی)

لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۹۱۶ء میں مدارسِ برطانیہ کے رشید ترین متعلمین
سے شہنشاہِ بابر پر مضامین لکھائے اور متعدد انعامات عطا فرمائے تھے، ان ہونہار طلبہ نے جس
محنت و توجہ اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا اور جو کچھ لکھا وہ ان کی بالغ نظری پر شاہد ہے، اور سوسائٹی
کے رسالہ کے صفحات (ص ۹۶ سے ۴۰۰ تک) ان کی روداد سے مالامال ہیں، بابر کی صفاتِ ذاتی
کا ذکر، اس کی تحریر کی تحسین، عبارت کا اختصار اور روانی، قلم کا زور، ہر چیز پر ہر ایک لکھنے والے
نے نگاہ ڈالی ہے، توزک کا ایک نادر مخطوطہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، یہ عہدِ اکبری کا ہے اور
اس کا ذخیرۂ تصاویر بھی اسی زمانہ کا تیار کیا ہوا ہے، ہر مضمون نگار نے اس سلسلہ کی ہر ایک تصویر
کو جدا جدا غور و توجہ سے دیکھا اور ہر ایک پر تبصرہ کیا ہے، یہ تصاویر حد درجہ خوبصورت، اور
بہ غایت پسندیدہ و دل فریب ہیں، لین پول (LANE POOLE) نے ترجمۂ تزک کی تمہید میں

ان کی پوری ستائش کی ہے، بابر کا فرزند دلبند کو نصیحتیں کرنا، طرزِ تحریر سکھانا، اس کے قلم کی ہر جنبش
بجائے خود سبق آموز ہے، میرا مقصود ان ہدایات و ارشادات سے ہے جو باوجود تمام دشت
نوردیوں اور نبرد آزمائیوں کے بابر نے مرزا کامراں کے لئے لکھی تھیں، مذہب اور اخلاق کا
سبق دینے کے لئے مثنوی مبین اور مذاقِ سخن چمکانے یا پیدا کرنے کے لئے رسالہ ”والدیہ“ منظوم
خاص طور پر شہرت و امتیاز رکھتے ہیں،

ہل من مزید، ایک تیسرے نام سے فارسی کی یہی کتاب میرے مطالعہ میں آرہی ہے، یہ
نسخہ چترا پربھا پریس کا مطبوعہ محرم ۱۳۰۸ھ مطابق اگست ۱۸۹۰ء کا ہے، اس کے طابع فارسی
کتابوں کے مشہور ناشر مرزا محمد شیرازی ملک الکتاب ہیں، مرحوم نے سرورق پر اس کو بابر نامہ
موسوم بہ توزک بابری و فتوحات بابری لکھا ہے، بابر نامہ میں نے انگریزی تبصروں، بالخصوص
سر لوکاس کنگ (SIR LUCAS KING) وغیرہ کی تحریرات میں بیشتر دیکھا ہے،
یہ صاحب ڈبلن یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے پروفیسر اور ہندوستان کی تواریخ پر لکچرر اور
کبھی ہمارے ملک کی سول سروس کے رکن تھے، انگریزی ترجمہ کی نظرِ ثانی و اشاعتِ جدید میں
بھی ممدوح کا ہاتھ تھا، مختصر یہ کہ عصرِ حاضر میں وہ ”بابریات“ کے سب سے بڑے ماہر اور باخبر مانے
جاتے ہیں،

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ باوصف تلاشِ بلیغ یہ کتاب دستیاب نہیں ہوتی تھی، بہ مشکل
پتہ چلا کہ عالی جاہ مہا مہو پادیا راجہ سانول داس جی بہادر ممبر کونسل راج اودے پور کے کتبخانہ
میں موجود ہے، وہاں سے حاصل کر کے اس کے چھاپنے کی تدبیر کی، افسوس ہے کہ باوجود سعیِ بسیار
پوری تصحیح نہ ہو سکی، اول تو ایک ہی نسخہ ملا پھر اس میں ترکی الفاظ کی بھرمار، اغلاط کا رہ جانا محض
مجبوری سے تھا، مرزا صاحب آگاہ فرماتے ہیں کہ ”یہ وہی ترجمہ ہے جو اکبر بادشاہ کے زمانۂ سلطنت

میں خانخاناں بیرام خاں نے خالیاً عن التحریف والتغیر ترکی سے فارسی میں کیا تھا، اور تجارب الملوک نام رکھا تھا، معقول ہیچ مداں عرض کرے گا کہ اس کے تمام اغلاط لغوی و معنوی وقتِ طباعت اونکی توجہ سے رفع ہو سکتے تھے، بیٹے یعنی عبدالرحیم خاں کے بجائے، اس کے باپ بیرام خاں کے ساتھ اس ترجمہ کا انتساب صریحاً ظلم اور مسلماً غلط ہے، اور خاتمہ نویس (خود مرزا) کی بے احتیاطی، کمیِ توجہ بلکہ (سوء ادب نہ ہو تو کہوں گا کہ) ناواقفیت و قصورِ اطلاع پر مبنی ہے،

کتاب ہر ایک کے لئے سہل الفہم نہیں ہے، اصلاً عبارت آسان و شیریں ہے، لیکن نامانوس اصطلاحات، بیگانہ ناموں اور غریب و اجنبی الفاظ نے پیچیدہ و دشوار تر بنا دیا ہے، قدم قدم پر انگریزی ترجمے اور اس کے نفیس و فائدہ بخش ذخیرۂ حواشی اور یادداشتوں کی طرف استدراکاً رجوع کرنا پڑتا ہے،

وقائع کہنے والے دوست سُن لیں کہ خان خاناں نے ہر سال کے تحت جو حوادث و سوانح درج کئے ہیں، اکثر و بیشتر ان کا عنوان "وقائع سنہ فلاں" قائم کیا ہے،

ڈیڑھ صفحہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ موسیو کوریٹل نے توزک بابری کے (بلا تفصیل و تسمیہ) تین فارسی ترجمے بتائے ہیں، مسٹر اَرْوِین صرف دو لکھتے ہیں (جرنل رائل سوسائٹی، جولائی سنہ ۱۹۱۰ صفحہ ۹۴) مسٹر کوزنیس (COUSENS) واقعات بابری یعنی زیر بحث ترجمہ کے سوا ایک اور یعنی پائندہ حسن کا بھی نام لیتے ہیں (جرنل مذکور سالہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۷۶) یہ عاجز اس کی دستیابی سے قاصر ہے،

(باقی)

سر اقبال مرحوم اور انکی شاعری

از

ڈاکٹر حفیظ سید ایم اے، ڈی لٹ پروفیسر، الہ آباد یونیورسٹی

سر اقبال مرحوم کو جو ذہن و ذکا اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور تحصیلِ علم کے لئے جو ذرائع اون کو حاصل تھے، وہ موجودہ دور کے کم شعراء کو نصیب ہوئے، ہون گے، یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے ہی انھون نے شمس العلماء میر حسن کے فیضِ تلمذ سے فارسی زبان مین عبور حاصل کر لیا تھا، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کی تعلیم کے زمانہ مین انھون نے انگریزی ادب، فلسفہ اور اقتصادیات کا گہرا مطالعہ کیا، اور ایم اے ہونے کے بعد ہی اسی کالج مین انگریزی ادب اور فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے، اور کئی سال تک اسی عہدہ پر رہے، اس زمانہ میں انھیں اپنا مطالعہ کرنے کا پورا موقع ملا، اس کے بعد ستمبر ۱۹۰۵ء مین کیمبرج گئے، یہان وسعتِ نظر مین اور ترقی ہوئی، اور یورپ کے قیام کے زمانہ مین انھون نے مغربی تہذیب و معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا، اور تاریخ اسلام و فلسفۂ اسلام کے غامض مسائل پر غور و فکر کی نظر ڈالی، اس سے ان کے دل مین یہ اعتقاد راسخ ہو گیا، کہ اصل زندگی روحانی ہے، اور اسی مین انسانی فلاح مضمر ہے، اور روحانی زندگی کا صحیح اعتدال اسلام مین ہے، اس لئے اس کو مغربی ملکون مین پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی، یہی ان کی پیامی شاعری کا سب سے پہلا محرک ہے،

اقبال ولایت کی واپسی کے قبل ہی سے طبع آزمائی کرتے تھے، اس زمانہ مین بھی انکی

شاعری زیادہ تر اجتہادی اور کچھ رسمی شان لئے ہوئی تھی، لیکن رسمی شاعری بھی حسن و عشق کے فرسودہ خیالات تک محدود نہ تھی، اس میں بھی مذہبی عنصر موجود تھا، اس کے بعد وہ جتنا آگے بڑھتے گئے، یہ عنصر زیادہ نمایاں ہوتا گیا، تاآنکہ ان کی شاعری سراسر تعلیم و پیام بن گئی، مسلمانوں کے ملی جذبات کو بیدار کرنے میں ان کی شاعری کو بڑا دخل ہے، خصوصاً نئی پود اور جدید تعلیم یافتہ گروہ کی مسموم مغربیت کے لئے تو اس نے تریاق کا کام کیا،

علامہ اقبال کی شاعری کی وسعت نے ہماری تمام دینی قومی اور ملی ضرورتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا، وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے حامی تھے، اور ایک زمانہ تک اس کے پرجوش مبلغ رہے، جس پر ان کا ابتدائی کلام شاہد ہے، جب ان کے خیالات میں اور زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی، اور انسانی برادری کا اور وسیع نظر سے انھوں نے مطالعہ کیا، تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہی سمندر کے قطرے ہیں، اور قومیت و وطنیت رنگ و خون کی تقسیم کے باوجود سب انسانیت کے ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں، ان کو اس ہستی علی الاطلاق پر کامل اعتقاد تھا، جو ساری مخلوق کی خالق اور سب سے بلند و برتر ہے، وہ ایک سچے مسلمان کی طرح اسکی رضا اور اسکی مخلوق کی خدمت کو دین و ایمان سمجھتے تھے، یہی عقیدہ ان کی شاعری کی روح ہے، اور انہی خیالات و مقاصد کے وہ ترجمان تھے، انھوں نے کبھی فرمائشی نظم نہیں لکھی، اور نہ کبھی کسی کی مدح سرائی سے اپنی شاعری کو آلودہ کیا،

ان کے تمام خیالات و کلام پر ان کے ذاتی فلسفۂ حیات کا رنگ چڑھا ہوا ہے، جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر قائم ہے، انسان کی عظمت و شرافت پر ان کو یقین کامل تھا، اسی لئے انفرادیت اور ہستی کی تکمیل ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے، ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ فرد کی طرح قوم کو بھی اپنی انفرادی خصوصیات کا تحفظ اور انکی نگہداشت کرنی چاہئے، کسی قوم کی کورانہ تقلید میں

اپنی خصوصیات کو ہرگز ضائع نہ کرنا چاہئے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ڈاکٹر اقبال قومی و نسلی امتیازات قائم کرتے تھے، بلکہ اس لئے کہ ایک قوم دوسری قوم کی کورانہ تقلید سے اپنے جوہر کھو دیتی ہے، ورنہ قوموں کے اتحاد کے بارہ میں تو ان کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے نسلی امتیازات مٹا کر تمام انسان ایک الٰہی مرکز پر جمع ہو جائیں،

ڈاکٹر اقبال میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک حقیقی شاعر کے لئے ضروری ہیں، ان کو فطرت کی جانب سے حساس دل اور مفکر دماغ عطا ہوا تھا، اور ان کا مقام رسمی شاعری سے بہت اونچا تھا، ان کی شاعری فکر و تاثیر کا نتیجہ تھی، واقعات و حوادث اور حالات و مقامات ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھارتے تھے، قرطبہ اور اسپین کی سیر اور نپولین اور حکیم سنائی کی قبر کی زیارت نے ان کے دل میں، ماضی کے واقعات کی یاد تازہ اور ان کے پرسوز جذبات کو برانگیختہ کیا، اس اثر کے تحت میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ اس اثر کی پوری ترجمان ہیں، وہ الفاظ کے بھی صناع تھے اور ان سے عجیب کیف و ترنم پیدا کرتے تھے، یہ ان کا اعجاز تھا کہ چند اشعار میں ایسے عمیق خیالات بھر دیتے تھے کہ جن کی تفصیل کے لئے دفتر چاہیئے،

عقائد میں ان کے خیالات نہایت ٹھیٹھ اور راسخ تھے، عہد حاضر کے مغربی تمدن اور اس کے مذہب سیاست اور معاشرت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور اس کے متعلق ایک مستقل رائے رکھتے تھے، توحید باری اور روحانی زندگی کی حقانیت و صداقت پر کامل ایمان تھا، ان کے عقیدہ میں چشم ظاہر بیں سے پنہاں اور عقل و فہم سے ماوراء ایک ذات بحت ہے جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے، یہی ذات بحت سارے وجود کا سرچشمہ ہے، اس لئے اس کی طرف رجوع اور انابت ہمارا فرض ہے، ان کے ان خیالات کے متعلق ان کی بعض نظمیں نقل کی جاتی ہیں،

خداوند تعالیٰ اقبال نے قرطبہ کی مسجد میں ایک نظم دعا کے عنوان سے کہی تھی اس سے ان کے

جوشِ ایمان اور توحید پرستی کا اندازہ ہوتا ہے،

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر	میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور	تجھ سے مرے سینہ میں آتشِ اللہ ھُو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ	تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو

انسان کی صلاحیت وقابلیت

اقبال کو انسان کی غیر محدود صلاحیت وقابلیت پر کامل یقین تھا، وہ اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض تصور کرتے تھے، وہ اس کی روحانی عظمت کو ثابت کرتے ہیں، اُسے شاندار مستقبل کی امید دلاتے ہیں، جس تارکِ خودی کو اپنی صلاحیتوں کا احساس نہیں اُسے وہ زمرۂ انسانیت سے خارج سمجھتے تھے، وہ ہمیشہ انسان کو حسنِ عمل اور عالی حوصلگی کی ترغیب دلاتے ہیں کہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو، اور اپنی ہستی کو حقیر و ذلیل نہ سمجھے ان کے نزدیک اگر انسان کا عقیدہ پختہ، عزم راسخ اور ہمت بلند ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، وہ خاک کا ذرہ نہیں جسے ہوا کے جھونکے ادھر اودھر اڑائے پھرتے ہیں، جب تک وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے وہ پست ہے، جوں ہی اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی، وہ خلافتِ الٰہی کا اہل ہوگیا، اس کا مستقبل اور اس کی تعمیر خود اس کے اختیار میں ہے، انسان کو ذلیل وخوار کرنے والی چیز مادہ پرستی ہے، اگر وہ خلیفۃ اللہ بننا چاہتا ہے تو اسے "یقین محکم" "عمل پیہم" اور "محبت فاتحِ عالم" پر عمل پیرا ہونا چاہئے، ذیل کے اشعار اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں:-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو	قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو	دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی	تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری	میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں	وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی	کھلتے ہیں غلاموں پہ اسرارِ شہنشاہی

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی	خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

خودی

اقبال کا سارا زور "خودی" پر ہے، لیکن اس کو ایسے مبہم معنوں میں استعمال کیا ہے کہ لوگوں نے اس کی مختلف تعبیریں کی ہیں، اور اس کے مختلف معنی پہنائے ہیں، راقم نے جو کچھ سمجھا ہے اس کو ذیل میں پیش کرتا ہے،

تصوف کی رو سے انسان کو دو طرح کی خودی بخشی گئی ہے جس کو تصوف کی اصطلاح میں بالترتیب "انانیت شخصی" اور "انانیت حقیقی" کہتے ہیں، اول الذکر سے مراد جسم حواسِ خمسہ اور دل و دماغ ہے اور جو چیز مستقل ناقابلِ تغیر اور غیر فانی ہے وہ انانیت حقیقی ہے، اور اس میں لاتعداد صلاحیتیں مخفی ہیں، بعض اوقات خودی کا لفظ خود بینی خود پرستی اور خود نمائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اوصاف انسان کے شایانِ شان نہیں، اس لئے اقبال نے خودی کو ان معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے ان کی مراد انسانی انانیت انفرادیت ہے، جو فردِ واحد کو دوسرے افراد سے ممتاز کرتی ہے، اس شخص کو جسے اپنی ذاتی انفرا

احساس ہے اسے انفرادیت کی نگہداشت اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے، اور دوسروں کی تقلید جامد سے بچکر خود مستقل بالذات اپنا وجود قائم کرنا چاہئے، چونکہ افراد ہی سے قوم بنتی ہے اس لئے جب افراد اپنے اوصاف کی نگہداشت کریں گے تو قوم کی نگہداشت خود بخود ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ نے انسان میں خاص خاص اوصاف ودیعت کئے ہیں، اس لئے اس کا فرض ہے کہ ان کو کام میں لائے اور اپنا مقصد حیات پورا کرے،

روح انسانی جو ناقابل تغیر اور غیر فانی ہے انانیت شخصی سے جو تغیر پذیر اور فانی چیزوں سے عبارت ہے بالاتر اور شریف تر ہے جس میں لامحدود ترقیوں کی استعداد ودیعت کی گئی ہے، یہی وہ انانیت اور خودی ہے جس کو سمجھنے پہچاننے اور برتنے پر علامہ مرحوم نے زور دیا ہے اور بار بار اس کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، اس غیر فانی انانیت کو ریاضت نفس کشی، ترک خواہش اور ذکر و فکر کے ذریعہ تربیت دے کر ترقی کے معیار پر پہنچایا جا سکتا ہے، اگر انسان کو اپنی حقیقی صلاحیتوں اور روحانیت کا احساس ہو جائے تو وہ دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی کو حاصل کر سکتا ہے، اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے انسان کو جو اہمیت حاصل ہے اسے اس طرح بیان کیا ہے،

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تو جہاں کے لئے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

خودی کا وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں — تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

بے ذوق نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی

رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی — شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق سے محبت

اقبال کا دل نوعِ انسانی کی محبت کا خزینہ ہے اور وہ ہر انسان سے اسی جذبۂ محبت کی توقع کرتے ہیں،

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اس ہمہ گیر اخوت میں فرقہ پرستی کی گنجایش نہیں، عشقِ مخلوق عشقِ خالق ہی کا پرتو ہوتا ہے، اس جذبہ سے جغرافی اور قومی حدود و قیود ٹوٹ جاتے ہیں اور ہر قوم و ملک کا آدمی اپنا ہی کنبہ نظر آتا ہے،

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

آزادی اور جدت تخیل

جرأت و آزادی اقبال کی شاعری کا نمایاں وصف ہے، وہ ہر خیال کو آزادی اور بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں، وہ خود کہتے ہیں،

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نہ بندۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اقبال کے سوا موجودہ دور کے کسی شاعر کے کلام میں یہ صداقت نہیں ملتی، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مومن کامل بھی تھے اور فلسفی بھی،

جن لوگوں کو اقبال سے ذاتی واقفیت ہے انھیں اسکے ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ اقبال نے نہ صرف اپنے حکیمانہ خیالات کے اظہار میں بے باکی سے کام لیا بلکہ وہ خود بھی ان پر عامل تھے، بڑے بڑے لوگوں سے جن میں والیانِ ریاست بھی تھے ان کے تعلقات تھے لیکن انھوں نے کبھی کسی کی مدح سے اپنی بلند شاعری کو داغدار نہیں کیا، وہ ایک آزاد قانع اور مستغنی درویش تھے، خود کہتے ہیں،

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی — کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

اقبال اور تہذیب جدید

اقبال تہذیب جدید کی پیداوار تھے اور ایک زمانہ تک یورپ میں رہے اس کے علوم و فنون کا مطالعہ کیا، یورپ کے مختلف حصوں کی سیاحت کی، اس اعتبار سے ان کو تہذیب جدید کا فرزند ہونا چاہئے تھا لیکن یہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری نظر فریبی نے انکی آنکھوں کو خیرہ نہیں کیا تھا، بلکہ وہ اس کے سب سے بڑے ناقد تھے اور اس کی مادہ پرستی اور فریب سیاست کو انسانیت کے لئے ہلاکت تصور کرتے تھے، اس کا سبب ان کا فلسفۂ خودی ہے کہ ہر فرد اور قوم کو اپنی انفرادی ہستی برقرار رکھنی چاہئے اور دوسری قوموں کے سحر سے مسحور ہوکر اپنی ہستی نہ کھو دینی چاہئے، مشرقی قوموں کو مغرب کی مادہ پرستی سے بچانا ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ مشرقیوں کے لئے درسِ بصیرت ہے، اس تہذیب کی رگ پر انھوں نے خوب خوب نشترزنی کی ہے،

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی که ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

اخوت اور مساوات اسلام

اسلام نے جس اخوت و مساوات کی تعلیم دی اور آنحضرت صلعم نے جس کی عملی بنیاد قائم کی وہ دنیا کا عظیم الشان معجزہ ہے، اس اخوت کی بنیاد، دین و اخلاص اور محبت و رواداری پر قائم تھی، اسی مساوات کا کرشمہ تھا کہ انصار نے اپنی آدھی ملکیت مہاجرین میں تقسیم کردی تھی، اور ایک حبشی غلام ایک قریشی سردار کا ہمسر ہوگیا تھا، کیونکہ اسلام میں فضیلت کا معیار وجاہت کے بجائے تقوی تھا، اسلام نے خون اور رنگ اور قومیت اور جنسیت کے قابلِ نفرت

امتیاز کو فنا کردیا تھا، آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ بنی نوع انسان اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے جو شخص اس کے کنبہ کی خدمت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے عزیز رکھتا ہے، ظہور اسلام سے پہلے انسان کی عزت کا معیار خاندانی و موروثی امتیازات اور دولت و ثروت تھی، اسلام نے ایسے ناقص معیار کو مٹا کر تقوی کو معیار قرار دیا، اس بلند معیار نے سارے دنیاوی امتیازات باطل کردیئے اور مسلمانوں میں بے نظیر مساوات قائم ہوگئی اور آقا و غلام اور مالک و مملوک ایک صف میں آگئے،

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رو ہوکے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائیگا ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والاگہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں غلامی ہے اسیرِ امتیازِ رنگ و بو رہنا
شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں مردوں کی یہ شمشیریں

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

قومیت

سفر یورپ سے قبل اقبال قومیت کے حامی تھے جس کا اثر انکی ابتدائی دور کی شاعری میں موجود ہے، ترانۂ ہندی اسی سلسلہ کی مشہور نظم ہے، پہلے ان کا خیال تھا کہ تعمیر و ترقی کے لئے قومیت ضروری چیز ہے اور ہندوستانیوں کو مذہبی اختلاف سے قطع نظر کرکے باہم مل کر قومیت

کی تعمیر کرنی چاہئے، ان کا مشہور شعر ہے،

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا   ہندی ہیں ہم وطن ہی ہندوستاں ہمارا

اس قسم کے اور اشعار بھی ان کے یہاں ملتے ہیں،

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں   بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے   سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

لیکن اسلام کے گہرے مطالعہ اور یورپ کے قیام اور اس کی سیاست پر غور و فکر نے ان کے سامنے یہ حقیقت ظاہر کی کہ قومیت و وطنیت کا تخیل محض نسلی تعصب پر مبنی ہے، اور اسلامی اخوت کی ہمہ گیر اور وسیع تعلیم کے مقابلہ میں بہت محدود ہے، بلکہ اس نے مخلوقِ خدا کو قومیتوں میں اس طرح بانٹ رکھا ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کی دشمن ہے، اس انکشافِ حقیقت کے بعد انھوں نے قومیت و وطنیت کے متعصبانہ اور محدود تصور کو چھوڑ کر بنی نوعِ انسان کی اخوت کے ہمہ گیر تصور کو اپنا مسلک بنایا، چنانچہ فرماتے ہیں،

جو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی   رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی   دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے   ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اس سے باہر جہاں مشرقی تہذیب و تمدن کا احترام کیا جاتا ہے پھیلی ہوئی ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت و فلسفیانہ برتری کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، خلقِ خدا سے جتنی ان کو محبت ہے اور اسلام کی تعلیمات کی جس جوش و صداقت کے ساتھ تبلیغ و ترجمانی کرتے ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کا فارسی اور اردو کلام دونوں ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت ہے، قوموں اور ملتوں کی حیات کی تفسیر اور فلسفہ

و تصوف کے حقائق کو غزل کی نرم و نازک زبان میں ادا کرنا ان کا خاص حصہ ہے، دقیق مسائل کی ترجمانی کے باوجود وہ شاعرانہ لطافتوں کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے ہیں، اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو ایسی سلجھی ہوئی اور دلکش زبان میں ادا کرتے ہیں کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے، معنوی اعتبار سے ان کے کلام پر غالب اور مولانا روم کا زیادہ اثر ہے، شکوہ الفاظ میں سودا کا زورِ بیان اور کہیں کہیں میر کے درد کا اثر پایا جاتا ہے، وہ الفاظ کے تناسب بندش کی چستی سے کلام میں نہایت لطیف موسیقیت پیدا کر دیتے ہیں،

شاعری کے اصول و قواعد کے اعتبار سے بھی ان کا کلام پختہ ہے، وہ عروض و قوافی اور زبان کے قواعد کی پابندی کرتے ہیں، لیکن دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کی کورانہ تقلید نہیں کرتے بلکہ ایک اجتہادی شان ہے،

اقبال کی شاعری چونکہ حکیمانہ ہے اس لئے کہیں کہیں اس کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن اگر انکے فلسفۂ حیات اور ان کے پیام کی نوعیت اور مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو کلام کے سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں ہوتا، وہ خود کہتے ہیں،

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا   کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

تلخیص و تبصرے

مجلسِ تاریخ ہند

انڈین ہسٹری کانگریس (مجلس تاریخ ہند) کا پانچواں سالانہ اجلاس حیدرآباد دکن میں راؤصاحب سری نواس اچاری (اناملائی یونیورسٹی) کے زیر صدارت منعقد ہوا، اجلاس مختلف شعبوں میں تقسیم تھا، جن کی صدارت علٰحدہ علٰحدہ مختلف یونیورسٹیوں کے ہندو پارسی اور انگریز پروفیسروں نے کی، تاریخ دکن کا ایک خاص شعبہ تھا، اس کی صدارت نواب علی یاور جنگ بہادر نے کی، اسلامی ہند کی تاریخ سے متعلق مسلم اور غیر مسلم اربابِ قلم نے متعدد مقالے پیش کئے جن میں سے بعض کی تلخیص ذیل میں درج ہے،

میمن سنگھ کے ایک ہندو اہل قلم نے "چودھویں صدی عیسوی میں دربار دہلی کی ایک جھلک" پر ایک مقالہ پڑھا جس میں یہ بتایا کہ اس عہد کے سلاطین دہلی کو نئے شہروں کے آباد کرنے کا خاص ذوق پیدا ہوگیا تھا، جس کا مظاہرہ پرانی دہلی، کیلوگھری، سری، تغلق آباد اور جہاں پناہ کے کھنڈرات اب بھی کر رہے ہیں، سلطان فیروز نے فیروز آباد آباد کیا، جس کی شوکت کے لئے آٹھ نئی مسجدیں تعمیر کی گئیں، شاہی محل بہت وسیع تھا جس میں دربار کے لئے تین بڑے بڑے کمرے تھے، (۱) محل چوبیہ اس میں بادشاہ تخلیہ میں بیٹھ کر سیاسی معاملات پر گفتگو

کرتا تھا (۲) محلِ انگور، یہ گویا مغلوں کے عہد کے دیوانِ خاص کی طرح تھا (۳) محلِ میانگی یا محلِ بارِ عام، یہ گویا دیوانِ عام تھا، دربار میں نشست و برخاست، لباس اور امرا اور معزز عہدیداروں کی آمد و رفت کے خاص خاص آداب اور ضابطے تھے جن کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی، عیدین میں دربار کو آراستہ و پیراستہ کیا جاتا تھا، شب برات میں آتشبازی کے تماشے دکھائے جاتے تھے، کشتیاں روشن کرکے جمنا کی لہروں میں چھوڑ دی جاتی تھیں، بعض اوقات ان کشتیوں میں مقابلہ کی دوڑ ہوتی تھی،

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ایک لکچرار نے "سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں شاہی مجالس" پر ایک مضمون لکھ کر پیش کیا، اس مضمون میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس عہد کی مرکزی حکومت کا طرز زیادہ تر ایرانی اور رومی ریاستوں کے قوانین پر مشتمل تھا، بادشاہِ وقت ریاست کا اصلی اور قطعی حاکم ہوتا تھا، لیکن رسم و رواج کے مطابق اہم سیاسی مسائل پر گفت و شنید کے لئے منتخب عہدیداروں کی ایک مجلس خاص بھی منعقد ہوا کرتی تھی، یہ مجلس کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت نہیں ہوتی تھی، لیکن بادشاہ کی مطلق العنانی پر اخلاقی دباؤ رکھتی تھی، اس مجلسِ خاص کے علاوہ ایک مجلسِ خلوت بھی طلب کی جاتی تھی جس میں بادشاہ کے مخصوص قابلِ اعتماد عہدیدار شریک ہوتے تھے، بادشاہ تفریح اور تفننِ طبع کے لئے ایک مجلسِ عیش بھی منعقد کرتا تھا، جس میں اس کے ہم مذاق درباری مدعو ہوتے تھے، جو بادشاہ کی تفریح کا سامان بہم پہنچاتے تھے، مگر ان کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہوتی تھی، ایک مجلسِ عام بھی ہوا کرتی تھی جس میں بادشاہ ملک کے نظم و نسق کے متعلق مشورے کیا کرتا تھا، دربار کا انعقاد اعلٰی پیمانہ پر ہوتا تھا، حجاب کا ایک گروہ دربار کے ساتھ منسلک رہتا تھا، جو درباری آداب و مراسم کی نگرانی کرتا تھا، سجدہ، نذر، اور نثار (یعنی سونے چاندی کا نچھاور) آداب کے ضروری اجزا تھے، امیر حاجب یا حاجب خاص

حکومت کا نہایت معزز اور اہم عہدہ تھا، نذر کے آداب و مراسم کے لئے شحنۂ بارگاہ مقرر کیا جاتا تھا،

رام پور ہاٹ (بنگال) کے ایک مسلم مضمون نگار نے محمد بن تغلق کے عہد کے واقعات کے سنین پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس عہد کے واقعات کی سنہ وار ترتیب کے لئے احمد بن یحییٰ کی تاریخ مبارک شاہی کے بجائے عصامی کی فتوح السلاطین زیادہ معتبر اور مستند ہے، عصامی کی ترتیب کی تصدیق اس عہد کے سکوں سے بھی ہوتی ہے،

اندور کے ایک ہندو اہلِ قلم نے اپنے ایک مضمون میں یہ بتایا کہ ازمنۂ وسطیٰ میں چیتنیا کی مذہبی تعلیم کی ترویج سے مسلمان بھی متاثر ہوئے، اور بعض مسلمانوں نے ویشنو عقائد قبول کئے، اور اپنی عقیدتمندی میں رادھا اور کرشن پر مذہبی گیت بھی لکھے، جو ادبی حیثیت سے بھی علمی اور روحانی قابلِ قدر ہیں، مقالہ نگار نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ چیتنیا کی ویشنو تحریک محض ہندو اور مسلمان کے ثقافتی امتزاج کی ایک محمود کوشش تھی، اور ویشنو تحریک کے مسلمان مقلدوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو اور مسلمان روحانی طور پر مل سکتے ہیں (؟؟؟)

بھاگلپور کے ایک ہندو مضمون نگار نے سلطنتِ مغلیہ میں عیسائیوں کی حیثیت کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے آج کے آقاؤں نے اس کے کل کے آقاؤں سے کس طرح ارتباط پیدا کر کے رفتہ رفتہ یہاں کی پوری ملکیت حاصل کر لی، اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں عیسائیوں کے آنے کا کیا مقصد تھا، اور یہاں انھوں نے کیا کیا پیشے اختیار کئے، مغلوں میں کس طرح مذہبی تبلیغ شروع کی، کن کن ذرائع سے زمین خریدنے، گرجا بنانے، جلوس نکالنے اور مذہبی امور کی نمایش کرنے کے حقوق حاصل کئے، یہانتک کہ آخری مغل بادشاہوں کے زمانہ میں ان کا پورا تسلط ہو گیا، اس مقالہ میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کا جو رویہ رہا ہے اس پر مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بحث کی گئی ہے،

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک بنگالی اہلِ قلم نے ایک مقالہ میں اسمتھ، فرگسن، کین اور ہیول کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ اکبر کے مقبرہ کی تعمیر کا آغاز اکبر ہی کے ہاتھوں سے ہو گیا تھا، مقالہ نگار نے تزکِ جہانگیری اور مقبرہ کے کتبہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ مقبرہ جہانگیر کے پہلے سالِ جلوس میں بننا شروع ہوا، اور اس کے ساتویں سال ختم ہوا،

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ایک دوسرے لکچرار نے یونیورسٹی لائبریری کے "مخزن افغانی" کے دو قلمی نسخوں پر مقالہ لکھ کر یہ بتایا ہے کہ مخزن افغانی اور تاریخ خان جہانی دونوں ایک ہی چیزیں ہیں، اور الیٹ کے اس بیان کی کہ "تاریخ خان جہانی اور مخزن افغانی گو ایک ہیں مگر مخزن افغانی پہلے لکھی گئی اور اس پر نظر ثانی کر کے تاریخ خان جہانی نام رکھا گیا" تردید کی ہے کیونکہ دونوں نسخوں میں کسی لفظ اور عبارت کا کوئی اختلاف نہیں پایا ہے، اس مقالہ میں تاریخ مذکور کے مؤلف نعمت اللہ کے سوانحِ حیات کے متعلق بھی بعض معلومات فراہم کئے گئے ہیں، مقالہ نگار کے خیال کے مطابق اس کتاب کا اہم حصہ ساتواں باب ہے جس میں جہانگیر کے پہلے چھ سال کی حکومت کی تفصیل ہے،

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک دوسرے مضمون نگار نے وسط ایشیا میں شاہجہاں کی پالیسی پر بحث کر کے یہ دکھایا ہے کہ شاہجہاں کی وسط ایشیائی پالیسی جارحانہ نہیں بلکہ محض مدافعانہ تھی، وہ وسط ایشیا کی حکومتوں کا سیاسی توازن برابر رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس سے ہندوستان بیرونی حملوں سے محفوظ رہے، اس میں شاہجہاں کی جنگی مہم تو ناکام رہی، لیکن اس کی سیاسی پالیسی کامیاب

دہلی یونیورسٹی کے ایک مسلمان اہلِ نظر نے فرقۂ روشنیہ پر ایک مقالہ پیش کیا جس میں اس فرقہ کے عروج و زوال پر تبصرہ کیا گیا ہے، اس فرقہ کی بنیاد میاں بایزید انصاری نے ڈالی جو ۹۳۱ھ میں جالندھر میں پیدا ہوا، اور تیس سال کی عمر میں مہدویت بلکہ ایک طرح کی نبوت کا

دعوی کیا، مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اس کی تعلیم اعلیٰ نہ ہو سکی تھی، اس لئے اس کے فلسفیانہ نظریوں میں تعلیم کی کمی اور ذہن کی سراسیمگی نمایاں ہے، اس فرقہ کو اپنے مخالفین کو قتل کر دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا، اکبر نے اس گروہ کی مخالفت کی، اور اس سے جنگ کرتا رہا، اس فرقہ نے بھی مغلوں کی حکومت سے معاندانہ رویہ اختیار کیا، بایزید انصاری نے اپنی تعلیم کی کمی کے باوجود عربی، فارسی، ہندی اور پشتو میں کتابیں لکھیں، حال نامہ اس کی سوانح عمری اور مقصود المومنین میں اس کے عقائد کی تشریح ہے،

پٹنہ کالج کے ایک مسلمان مقالہ نگار نے اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دور میں بہار کے تاریخی حالات لکھ کر بعض ایسے صوبہ داروں کے نام پیش کئے ہیں جو عام تاریخوں میں نظر انداز کر دیئے گئے ہیں، اس میں حسین علی خاں بارہہ، غیرت خاں بارہہ، میر جملہ، سربلند خاں، خان زمان، امتیاز خاں، مرحمت خاں، اور مؤخر الذکر کے تین بھائیوں کے حالات خاص طور پر لکھے گئے ہیں،

تاریخ دکن کے شعبہ میں حسب ذیل مضامین پیش کئے گئے :-

"مجاہد شاہ بہمنی اور وجیانگر، عہد بہمنی میں تعلیمی حالات، سلطنت گولکنڈہ میں صنعت و تجارت، عبد اللہ قطب شاہ کا ایک مکتوب شاہ عباس ثانی کے نام، صلابت خاں دوم، شاہ جی کا ایک خط بیجاپور کے وزیر کے نام، ناصر جنگ دہلی کیوں طلب کیا گیا؟ تری گونڈا کی جنگ، حیدر آباد کا دفتر دیوانی و مال، شہر اورنگ آباد کی تاریخ،

"ص ع"

چینی مسلمان

ایک درد مند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان میں لکھے ہیں، ضخامت ۲۲ صفحے، قیمت :- ۸ر

اخبار علمیہ

کائنات کا معمّا

کیلی فورنیا میں ایک دوربین تیار کی جا رہی ہے جس میں دور کی چیزوں کے دیکھنے کی اتنی غیر معمولی قوت ہے کہ زمین سے چاند کی مسافت بظاہر پچیس میل معلوم ہوگی، ہیئت کی اس عجیب و غریب ایجاد سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہونگی، علماء ہیئت کی رائے ہے کہ ہیئت و نجوم کے سلسلہ کی ایجادوں نے سائنس کی پرانی تحقیقات پر کامل یقین پیدا کرنے کے بجائے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سائنس اپنی غیر معمولی ترقی کے باوجود انکشافات کے لحاظ سے ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہے، سنہ ۱۹۳۰ء میں سیارہ پلوٹان (PLUTD) کے انکشاف سے سائنس کی بہت سی پرانی تحقیقات غلط ثابت ہوگئیں، مثلاً آفتاب کا طول و عرض جتنا سائنس کے محققوں نے بتایا تھا اس سے دوگنا ثابت ہوا، اور نظام شمسی میں متعدد دنیائیں ہیں جن میں سے بعض ابھی معلوم نہیں ہو سکی ہیں، یہ تحقیق بھی غلط ثابت ہوئی کہ سیارے آفتاب سے ٹوٹ کر وجود میں آئے،

علم ہیئت کا یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ سیاروں میں کس قسم کی آبادی ہے؟ وہاں زندگانی کا وجود ہے یا نہیں؟ اب تک ماہرین سائنس کا خیال تھا کہ مریخ میں اتنی حرارت ہے کہ وہاں زندگی کا کوئی سوال نہیں، لیکن نئی تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ اس کی حرارت ایسی ہے

کہ اس میں زندگی کا وجود ممکن ہے، مذکورۂ بالائی دوربین سے سیاروں کی آبادی دیکھنے کی کوشش کی جائے گی، اس سے پہلے دوربینوں سے زہرہ کو دیکھنے کی کوشش کی گئی، مگر زہرہ پر بادلوں کی تہ اتنی گہری اور موٹی تھی کہ پہلی دوربینوں سے کامیابی نہ ہو سکی، جدید دوربین سے آفتاب کا بھی گہرا مطالعہ کیا جائیگا، سائنس کے بعض ماہرین کی رائے ہے کہ آفتاب کا قرص روز بروز تیزی سے جل رہا ہے، یہاں تک کہ ایک روز جل کر بالکل خاک ہو جائے گا اور دنیا اس کی روشنی سے محروم ہو جائے گی، سائنس کے فضلاء کا خیال ہے کہ آفتاب سے ایک سکنڈ میں چالیس لاکھ ٹن قوت صرف ہوتی ہے، جس میں سے صرف ۱۶۰ ٹن کی قوت کی روشنی دنیا میں پہنچتی ہے مگر اب نجوم و ہیئت کے ماہرین مشاہدہ کرکے بتاتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ آفتاب کا قرص روز بروز چھوٹا اور کمزور ہوتا جا رہا ہے، لیکن اس کی قوت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا دسواں حصہ ایک کرور کھرب سال میں صرف ہو سکے گا،

علم ہیئت میں شہاب ثاقب اب تک ایک پریشان کن معما ہے، علمائے ہیئت کا بیان ہے کہ شہابی اجزاء روزانہ بہ کثرت زمین پر آتے رہتے ہیں، لیکن اب تک یہ صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ اجزا کہاں سے اور کس طرح آتے ہیں، صرف یہ گمان کیا جاتا ہے کہ ستارے پھیل کر جب ٹوٹ جاتے ہیں تو ان کے اجزاء زمین پر گر جاتے ہیں، ان میں سے بعض اجزاء کا طول و عرض حیرت انگیز ہوتا ہے، اری زونا میں ایک باطیہ (CRATE) ٹوٹ کر گرا تھا جس کا قطر ایک میل تھا، اس سے بھی بڑا شہاب سائبیریا میں گرا جس سے کئی میل تک جنگل خاک سیاہ ہو گئے۔

ہیئت کے ماہرین کو اب تک دو اور باتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا ہے، ایک یہ کہ کائنات میں تخلیق کا خاتمہ کس منزل پر ہوگا، دوسری یہ کہ فضا میں خلاء ہے یا وہ کائنات کی

نامعلوم چیزوں سے پر ہے، آئنسٹائن کے نظریئے بھی اس کے متعلق خاطر خواہ معلومات فراہم نہ کر سکے، اسی سلسلہ میں کائنات کی اصل اور ابتداء کو بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جو سائنس اور ہیئت کے عالموں کے لئے معما ہے، اور محققین اب یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ سائنس اپنی ساری ترقیوں کے باوجود کائنات کے خالق کے اسرار و رموز کو معلوم کرنے سے قاصر رہیگی،

بڑے آدمیوں کی بعض دلچسپ باتیں

اسٹیٹسمین کے ایک مقالہ نگار کا بیان ہے کہ جرمنی کا مشہور شاعر شیلر اسی وقت اشعار موزوں کر سکتا تھا جب اس کے پاؤں برف کے تودے پر رکھے ہوتے تھے اور وہ سڑے ہوئے سیب کی بو سونگھتا رہتا تھا، یورپ کا مشہور ماہر موسیقی بیتھوون اپنی موسیقی کا کمال اسی وقت دکھاتا تھا جب اس کے سر پر برف کا پانی مسلسل ڈالا جاتا تھا، پروشیا کے فریڈرک اعظم کو لباس میں دوسرا کوٹ بدلنے سے بڑی نفرت تھی، اپنی پوری زندگی میں اس نے شاید دو یا تین کوٹ تبدیل کئے، طامس ڈی کوئنسی کے بھائی کو چھت کے اندرونی حصہ پر مکھی کی طرح چلنے کا جنون تھا، انگریزی زبان کے مشہور لغت نویس سموئیل جانسن جب ٹہلنے کیلئے باہر نکلتا تھا تو راستہ میں مکانات کے احاطہ کے جتنے آہنی کٹہرے ملتے تھے ان کی ہر سلاخ کو چھڑی سے چھونے کی کوشش کرتا، اگر اتفاقاً کوئی سلاخ چھوٹ جاتی تو پلٹ کر اس کو چھو لیتا، فرانس کا ایک شاعر اور سیاسی صحافت نگار جب باہر نکلتا تو ایک بڑی زندہ مچھلی لٹکائے رہتا تھا، جب لوگ اعتراض کرتے تو جواب دیتا کہ جب کتے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں تو مچھلی کیوں نہیں رکھی جا سکتی، سر آئزک نیوٹن جب کوئی چیز خریدتا تو ریزگاریوں کو بار بار گنتا، پھر بھی اس کو تشفی نہیں ہوتی، حالانکہ وہ ریاضی کا عدیم المثال عالم تھا، مشہور انگریز سپہ سالار لارڈ رابرٹ بلی کو دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوتا تھا، حالانکہ وہ اپنی شجاعت کے سلسلہ میں وکٹوریہ کراس حاصل کر چکا تھا،

"ص ع"

مطبوعات جدیدہ

تذکرۂ بے نظیر: مؤلفہ سید عبد الوہاب قزوینی دولت آبادی، تقطیع بڑی ضخامت ۱۵۷ صفحے، کاغذ بہتر، ٹائپ روشن، قیمت معلوم نہیں، پتہ:- کتابستان الہ آباد،

سید عبد الوہاب قزوینی دولت آبادی آزاد بلگرامی کے تلمیذ رشید اور بارہویں صدی ہجری کے ناقد سخنوروں میں تھے، ان کا تذکرہ بے نظیر فارسی شعراء کے مستند تذکروں میں ہے، اس میں بارہویں صدی کے ڈیڑھ سو ایرانی اور فارسی گو ہندوستانی شعراء کے مختصر حالات ان کے کلام پر تبصرہ اور اس کا نمونہ ہے، یہ تمام شعراء مؤلف کے قریب العہد اور بعض معاصر بھی ہیں، تذکرہ کی تالیف میں سرو آزاد، تذکرۃ الشعراء علی حزیں، حیات الشعراء محمد علی خاں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، مؤلف بلند پایہ ناقد اور سخن سنج تھے، اس لئے یہ تذکرہ تاریخی اور تنقیدی دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہے، جناب منظور علی صاحب نے اس نایاب اور قابل قدر تذکرہ کی تصحیح و ترتیب اور الہ آباد یونیورسٹی نے اسے شائع کر کے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے، اس کی اشاعت سے شائقین کو ایک مستند تذکرہ سے استفادہ کا موقع مل گیا،

عہد نبوی کے میدان جنگ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت: عمر پتہ: حبیب کمپنی کمل منڈی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن،

اسلام کے دور اول کی تاریخ پر نئے فنون کی روشنی میں بحث و تبصرہ لائق مؤلف کا

خاص موضوع ہے، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اس پر ان کے مضامین نکلتے رہتے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے جنگی نقطۂ نظر سے بدر، احد، خندق، فتح مکہ اور حنین و طائف کے غزوات پر بحث کی ہے، اس میں ان لڑائیوں کے اسباب، فریقین کی جنگی تیاریوں، جنگ کے حالات، میدان جنگ کا نقشہ، طریقۂ جنگ اور اس کے نتائج کی تفصیل ہے، لائق مؤلف نے ان لڑائیوں کے محل وقوع کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے اس لئے اس کتاب میں کتابی معلومات کے علاوہ اور بہت سے ایسے مفید معلومات ہیں جو محض کتابوں سے نہیں حاصل ہو سکتے تھے، ہر غزوہ کے متعلق نقشے اور فوٹو بھی دیدیئے ہیں، جس سے حالات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اردو میں اس نقطۂ نظر سے غزوات پر یہ بحث نئی چیز ہے،

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حصہ سوم): مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۷۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مع محصول ڈاک عہ، پتہ:- دفتر ترجمان القرآن لاہور،

ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست سے متعلق مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے قلم سے جو مضامین نکلے ہیں، ان کے دو مجموعے پہلے شائع ہو چکے ہیں، یہ تیسرا مجموعہ ہے، پہلے دونوں میں سیاسی جد و جہد میں مسلمانوں کے اشتراک کے ساتھ ہندوستان میں ان کے مستقل سیاسی وجود اور ان کی انفرادیت کے متعلق مولانا کے خیالات تھے، اس مجموعہ میں مشترکہ سیاسی نظام سے الگ خالص اسلامی نظام کے قیام اور مسلمانوں کی مستقل تعمیر و تشکیل کی دعوت ہے، اسکے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر اور ان کے تمام خیالات اس مجموعہ میں مل جاتے ہیں،

مرقع فطرت: مؤلفہ ڈاکٹر پریم ناتھ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ ار، پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی،

اس کتاب میں دنیا کی آفرینش کواکب کی پیدائش، ان کے نظام جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان کے ارتقا کی داستان بیان کی گئی ہے، مذہب کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کے باب میں مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے وہ انسان کے دور جہالت تک کی حد تک تو صحیح ہے لیکن الہامی مذاہب کو عقل انسانی کے ارتقاء کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں، خصوصاً اس سلسلہ میں اسلام کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بعض باتیں نہ صرف غلط بلکہ لغو مضحکہ انگیز اور اسلام سے مؤلف کی ناواقفیت کا ثبوت ہیں، مثلاً اسلام میں بت پرستی اور دیوتا کے آثار کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "ہر سال لاکھوں مسلمان دور دراز سے سفر کرکے مکہ کے کالے پتھر (حجر اسود) کی پوجا کرنے جاتے ہیں یا اسلام میں دو دیوتا ہیں، ایک نیک دیوتا جس کی پوجا ہوتی ہے، اور دوسرا بد دیوتا جسے شیطان کہا جاتا ہے" اس قبیل کے بعض اور خرافات بھی ہیں، یہ دونوں مثالیں اسلام کے متعلق مؤلف کے معلومات کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں، مؤلف تو ایک حد تک معذور ہیں کہ وہ ایسے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بعد ان کا ذہن و دماغ دیوی دیوتا اور بت پرستی کے تخیل سے خالی ہو ہی نہیں سکتا، ان سے زیادہ قابلِ ستایش مکتبہ جامعہ ہے جس نے اپنے یہاں ایسی مہمل کتاب کو جگہ دی،

سلطان احمد شاہ بہمنی، از مولوی ظہیر الدین صاحب ایم اے عثمانیہ، تقطیع بڑی، ضخامت ۷۷ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت: عمر پتہ: معتمد مجلس طیلسانین جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

جامعہ عثمانیہ کے ایم اے اور ایم ایس سی کے امتحانوں میں طلبہ سے زیر امتحان موضوع پر مقالے لکھائے جاتے ہیں، ان میں سے مفید مقالوں کو مجلس طیلسانین عام افادہ کی غرض سے شائع کرتی ہے، سلطان احمد شاہ بہمنی بھی اسی سلسلہ کا ایک مفید مقالہ ہے، سلطان مذکور

اپنے اوصاف و خصوصیات اور کارناموں کے اعتبار سے خاندان بہمنی کا نہایت ممتاز فرمانروا اور اس کا عہد بہمنی سلطنت کا دور زریں تھا، اس مقالہ میں سلطان کے سوانح و سیرت اور اس کے سیاسی، انتظامی، تمدنی اور علمی کارناموں کی تفصیل اور اس پر نقد و تبصرہ ہے،

برجیس طلعت: مصنفہ بلقیس ضیاء صاحبہ تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۹ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت: عہ پتہ: مصنفہ ۲۰۔ کیننگ روڈ، الٰہ آباد، یوپی،

مصنفہ اودھ کے ایک معزز خانوادہ کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں، اس ناول میں انھوں نے لکھنؤ کے قدیم تمدن، اس کی عظمت و شان، شرفائے اودھ کی تہذیب و معاشرت قدیم و جدید تمدن کی ملی جلی ہوئی گنگا جمنی نفاستوں اور نزاکتوں کا نقشہ پیش کیا ہے، واقعات مبالغہ سے پاک اور روزانہ کی زندگی سے متعلق ہیں، اس لئے خیالی افسانویت کے بجائے واقعیت کا پہلو نمایاں ہے، معاشرت میں تعلیم و تہذیب اور دولت و امارت کے ساتھ مذہب و اخلاق اور مشرقی خصوصیات کی نہایت معتدل آمیزش ہے، ناول کی ہیروئن برجیس طلعت کا کیرکٹر شریف اور بلند گھرانوں کی تعلیم یافتہ خواتین کا مثالی نمونہ اور اس کا ثبوت ہے کہ صالح اور صحیح تعلیم و تربیت سے عورتوں کے جوہر اور چمک جاتے ہیں اور وہ جہاں قدم رکھتی ہیں اپنی روشنی سے اجالا پھیلا دیتی ہیں، یہ ناول اونچے مسلمان گھرانوں کی اجلی اور ستھری معاشرت کا نقشہ، ایک تعلیم یافتہ مگر عالی ظرف اور دیندار خاتون، ایک وفا شعار اور سلیقہ مند بیوی، ایک سعادتمند اور سگھڑ بہو اور ایک شفیق اور ہوشمند ماں کی سرگذشت ہے، اس سے آجکل کی تعلیم یافتہ خواتین بہت کچھ سبق حاصل کر سکتی ہیں، زبان میں لکھنؤ کے روزمرہ کا لطف اور مذاق میں اودھ کے بے فکرے نوجوانوں کی شوخی اور بے باکی نمایاں ہے، مؤلفہ نے وقت کے بعض نیم مذہبی و مشرقی مسائل کے سلجھانے کی بھی کوشش کی ہے،

کلیات سلطان قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری تقطیع بڑی، ضخامت ایکہزار صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت: مجلد عہ۱۵ روپیہ، پتہ :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن،

دکن کے قطب شاہی سلاطین میں سلطان محمد قلی قطب شاہ اپنی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ دکھنی زبان کا قادر الکلام شاعر بھی تھا اور اس میں اسکا پورا کلیات موجود ہے لیکن ایک عرصہ تک کلیات کے متعلق مختلف قسم کے شکوک وشبہات رہے لیکن رفتہ رفتہ جب اس کے مختلف نسخوں کا پتہ چلتا گیا تو یہ شبہات دور ہوتے گئے اور یہ ثابت ہوگیا کہ کلیات محمد قلی قطب شاہ کا ہے اور دکھنی زبان میں ہے جناب محی الدین زور قادری نے مختلف قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے یہ صحیح اور جامع کلیات مرتب کیا ہے، کلیات کے شروع میں ساڑھے تین سو صفحوں کا مبسوط تبصرہ ہے جس میں سلطان کے تفصیلی حالات ہیں، یہ مقدمہ کتابی صورت میں الگ بھی چھپ چکا ہے اور مئی ۱۹۴۱ء کے معارف میں اس پر ریویو ہو چکا ہے، اصل کلیات تین حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصہ میں مختلف نظمیں ہیں، دوسرے میں غزلیں اور تیسرے میں قصیدے اور رباعیاں وغیرہ، ان کی مجموعی تعداد سات سو صفحوں کے قریب ہے، کلیات کی زبان بہت قدیم ہے، آج کے بہت سے الفاظ اور محاوروں کا سمجھنا بھی مشکل ہے، فاضل مرتب نے جابجا بین السطور میں ان الفاظ کے معنی اور تشریح لکھ دی ہے لیکن غالباً اس میں انھوں نے دکھنی زبان کے متعلق اپنے علم کا لحاظ رکھا ہے کیونکہ ایسے سیکڑوں الفاظ انھوں نے چھوڑ دیئے ہیں جنکو دکھنی زبان سے واقفیت نہ رکھنے والے بالکل نہیں سمجھ سکتے، یہ کلیات عام مذاق کی چیز نہیں، آثار قدیمہ کے طور پر صرف ارباب فن اس کے قدرداں ہوسکتے ہیں، تاہم اس سے یہ بڑا فائدہ حاصل ہوا کہ دکھنی زبان کا ایک قیمتی ادبی سرمایہ جو اردو زبان کی ایک اہم کڑی ہے محفوظ ہوگیا،

"م"

جلد ۴۹ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۲ء عدد ۲

مضامین